ریگزار کے موتی

ریگزار کے موتی

جلد اوّل

شیخ ایاز — حمید عظیم آبادی

شاہزادہ ایاز — صمد رضوی ساز

اشتیاق اظہر — حسن حمیدی

منظر ایوبی — شیخ راز

آفاق صدیقی

پاکستان رائٹرز گلڈ سب ریجن۔ سکھر

طابع وناشر ـــ آفاق صدیقی
پاکستان رائٹرز گلڈ سب ریجن سکھر
طبع اوّل ـــ اگست ۱۹۶۲ء
تعداد ـــ ایک ہزار

سرِ ورق

ڈیزائن ـــ نورالحسنین حیدری، ندر
آرٹ کونسل کراچی
کتابت ـــ محمّد ایوب سکھر
طباعت ـــ امیر پرنٹنگ پریس سکھر

اندرونی صفحات

کتابت ـــ محمّد ایوب سکھر
طباعت ـــ اتحاد پرنٹنگ پریس سکھر

(اس کتاب کا نام ہم نے محسن بھوپالی صاحب اور فنکدۂ حیدرآباد سے اُدھار لیا ہے)

سول ایجنٹ

عجائب بک اسٹور - سکھر

ترتیب

صفحہ

ابتدائیہ

وادیٔ مہران کا یہ علاقہ جسے عام طور پر رہگزار سمجھا جاتا ہے، علمی و ادبی لحاظ سے کبھی بھی ان مردم خیز خطوں سے پیچھے نہ رہا جنھیں قدرت ہمیشہ اپنی فیاضی سے نوازتی رہی ہے جس خطّے کا میں ذکر کر رہا ہوں اُس نے وہ زمانہ بھی دیکھا ہے جب "موئن جو دڑو" جیسے قدیم تہذیب کے مرکز کے عروج کا زمانہ تھا۔ اس عہد سے بھی دوچار ہوا ہے جو آریائی تہذیب کا گہوارہ تھا۔ اس دور کی خصوصیات بھی قبول کی ہیں جب بودھ مت اور جین مت کا پرچار تہذیبی عوامل کو ایک نئے سانچے میں ڈھال رہا تھا۔ پھر اس وقت کے اثرات بھی یہاں نمایاں رہے ہیں جب سکندرِ اعظم کے حملے سے یونانی علم و حکمت کا دور دورہ شروع ہوا اور ان سب میں بڑھ کر ان اسلامی ادوار کی چھاپ بھی اس خطۂ زمین پر بڑی گہری پڑی ہے جو محمد بن قاسم سے لے کر سلطنت مغلیہ کے تاجداروں تک علم و ادب کی انگنت شمعیں روشن کئے رہے۔ وہ شمعیں جنھیں پاکباز و ہردلعزیز صوفیائے کرام نے اپنے خونِ جگر سے روشنی دی اور اس روشنی سے تہذیب و تمدن کے لاتعداد چراغ روشن ہوئے۔

کہتے ہیں کہ سندھی زبان قدیم سنسکرت کی ایک پراکرت 'ورچڑا اپبھرنش' کی چار

علاقائی بولیوں یعنی سرائکی، وچولی، لاڑی، تھرتی، اور کچھی سے مل کر بنی، عربوں سے اہلِ سندھ کے تعلقات اسلام سے پہلے بھی رہے تھے۔ اس لئے کسی حد تک عربی الفاظ بھی اس میں شامل ہوتے رہے۔ عہدِ اسلامی میں جب محمد بن قاسم نے فاتح سندھ کی حیثیت اختیار کی اور عربوں کی خاصی تعداد سندھ میں آگئی تو عربی کے اثرات بھی نسبتاً بڑھ گئے پھر محمود غزنوی کے حملوں سے جب وادیٔ مہران میں فارسی کا دور دورہ ہوا تو سندھ میں فارسی کے اثرات بھی نمایاں ہونے لگے۔ اس طرح سندھی، عربی، اور فارسی کے میل جول سے ایک نئی زبان پیدا ہونے لگی جسے یقیناً بالکل ابتدائی دور کی اردو کہا جاسکتا ہے۔

قلی قطب شاہ اور اس کے بعد ولی دکنی یا گجراتی کو اردو شاعری کے ابتدائی دور کا مستند شاعر مانا جاتا ہے۔ ان دونوں شعرائے گرامی کا تعلق دکنی اردو سے تھا۔ لیکن اسی زمانے کے سندھی شاعروں میں بھی چند ایسے شاعر ملتے ہیں جنہوں نے فارسی شاعری کے ساتھ ساتھ اردو شاعری میں بھی کمال حاصل کیا۔ یہ بات الگ ہے کہ سیاسی اسباب کی بنا پر سندھ کے ابتدائی دور کے اردو شعرار کو وہ شہرت اور مقبولیت حاصل نہ ہوسکی جو دکنی شعرار اور بعد کو شمالی ہند کے اہلِ سخن کو حاصل ہوئی۔ بہرحال اردو کے ابتدائی دور سے لے کر آج کے ترقی یافتہ دور تک اس ریگزار نے ہر زمانے میں اردو شعروادب کی نشوونما کا حق ادا کیا ہے جس کا ثبوت محققینِ ادب کی ان گرانقدر ادبی تحقیقات سے بخوبی مل سکتا ہے جو قیامِ پاکستان کے بعد پہلے سے کہیں زیادہ بہتر طور پر اہلِ ادب کے سامنے آتی رہی ہیں۔

"سندھ میں اردو ادب کی ترقی و ترویج" ایک ایسا موضوع ہے جس پر کافی سے زیادہ تحقیقی مواد مل سکتا ہے۔ لیکن یہ اتنا بڑا کام ہے کہ اچھوں اچھوں کی ہمت پست ہوجاتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مستقبلِ قریب میں کوئی ذی ہمت محقق اور صاحبِ قلم اس

موضوع پر وہ ناقابلِ فراموش تحقیقی کام کر سکے جس کی ضرورت عرصہ سے محسوس کی جا رہی ہے۔

چونکہ اس ریگزار نے ہر دور میں برصغیر کے لسانی روابط میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے اس لئے اردو کے اثرات بھی یہاں کی زبان وادب میں شامل رہے ہیں۔ اگرچہ یہ خطّہ اردو کے گہوارے سے دور واقع ہونے کی وجہ سے کچھ زیادہ متاثر نہ ہو سکا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ سندھ کا ذی علم طبقہ کبھی بھی اردو سے بیگانہ نہ رہا۔

تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں جبکہ قلی قطب شاہ نے دکھنی اردو میں شعر کہے تو یہاں "تاریخِ معصومی" کے مصنف میر معصوم بکھری کے چھوٹے بھائی میر فاضل بکھری نے بھی اردو شاعری کو اپنایا۔ یہ وہی میر فاضل ہیں جن کے متعلق "ذخیرۃ الخوانین" نے لکھا ہے کہ "شعر بہ زبانِ ہندی بکمال فصاحت می گفت وقبولیت داشتہ۔"

تذکروں، تاریخی کتابوں اور ادبی مقالات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اردو شاعری اس سرزمین میں بھی ہمیشہ قدر ومنزلت حاصل کرتی رہی اور یہاں سندھی کے ساتھ ساتھ اردو کے ویسے ہی باکمال شعراء پیدا ہوئے جیسے دکن، اور شمالی ہند میں تھے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی میں جب میرؔ، سوداؔ، دردؔ، میر حسنؔ، جراتؔ، انشاؔء، مصحفیؔ نظیرؔ اکبر آبادی، آتشؔ، ناسخؔ، غالبؔ، ذوقؔ اور مومنؔ جیسے قادر الکلام اہلِ سخن شمالی ہند میں شعر وسخن کی محفلوں کو گرما رہے تھے، عین اسی زمانے میں یہاں فائزؔ، ضیاءؔ، کاملؔ، ثابتؔ، قانعؔ، سچلؔ، سرمستؔ، بیدلؔ، اور سانگیؔ جیسے باکمال شعراء بہ یک وقت فارسی، سندھی اور اردو میں شعر وشاعری کا جادو جگا رہے تھے۔

بیسویں صدی کی سیاسی تحریکوں نے برصغیر کے ہر علاقے میں جو ذہنی بیداری پیدا کی اس کا اثر ادبی تحریکوں پر بھی پڑا۔ اس صدی میں ۱۹۴۷ء سے پہلے سندھی اہلِ ادب کی زیادہ تر توجہ سندھی زبان وادب کی طرف رہی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سندھی

ادب ہر قسم کی شعری اور نثری شاہکاروں سے مالا مال ہو گیا۔ جدید شاعری، جدید افسانہ نگاری اور جدید تنقید نگاری کے میدان میں اردو ادب نے ترقی کی جتنی منزلیں طے کی ہیں اتنی ہی سندھی ادب نے بھی، یہ اور بات ہے کہ نشر و اشاعت کی جو آسانیاں اردو ادب کو حاصل رہیں وہ سندھی ادب کو حاصل نہ ہو سکیں۔ اور اس کا عمل دخل صرف صوبۂ سندھ ہی تک محدود رہا۔

قیامِ پاکستان کے بعد تبادلۂ آبادی نے بے شمار سندھی ادیبوں اور شاعروں کو بھارت کے بڑے بڑے شہروں میں پھیلا دیا اور بھارتی صوبوں کے لاتعداد اہلِ قلم کو وادیٔ مہران نے اپنے دامن میں پناہ دی۔ کراچی، حیدرآباد، اور سکھر وغیرہ پہلے ہی سے اس وادی کے اہم ادبی مرکز تھے۔ اب ان مرکزوں میں سندھی ادب کے ساتھ ساتھ اردو ادب سے دلچسپی لینے والوں کی تعداد بھی بڑھنے لگی۔ سندھی ادب اور بالخصوص سندھی شاعری نے اردو شاعری کو شاہ لطیفؔ، سچلؔ سرمست، سامیؔ، بیدلؔ اور سانگیؔ جیسے بلند پایہ شاعروں کے کلام سے آشنا کیا اور اردو شاعری نے ایک مرتبہ پھر بہت سے ذہین شاعروں کو سندھی کے علاوہ اردو میں بھی شعر کہنے کی طرف رجوع کیا۔ ساتھ ہی سندھی کے چند ممتاز نثر نگاروں نے اردو نثر نگاری کی جانب توجہ دی اور سندھی ادب کے متعلق قابلِ قدر مضامین لکھے جانے لگے۔

وادیٔ مہران کے اہلِ قلم کی اس یکجہتی سے بڑے خوش آئند نتائج برآمد ہوئے۔ خاص طور پر سکھر کی ادبی فضا کے نکھارنے میں مصنفین اور ادبی کارکنوں کے اشتراکِ عمل نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ حیدرآباد، میرپور خاص، لاڑکانہ، نوابشاہ، خیرپور، جیکب آباد اور شکارپور میں بھی ایسے ادبی ادارے موجود ہیں جو اتحاد و یگانگت کی فضا قائم کئے ہوئے ہیں۔

خیرپور ڈویژن کا ادبی ماحول

چونکہ اس کتاب میں جو لکھنے والے شامل ہیں ان کا تعلق خیرپور ڈویژن کے چند شہروں سے ہے۔ اس لئے بہتر ہوگا کہ ان شہروں کی ادبی سرگرمیوں کا کچھ ذکر کیا جائے۔

★ "سکھر" کو اس ڈویژن میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہ شہر نہ صرف ایک بڑا تجارتی مرکز ہے بلکہ عرصہ دراز سے اسے ادبی مرکز کی حیثیت بھی حاصل رہی ہے۔ تقسیم ملک کے بعد یہاں ۱۹۴۷ء میں پہلے ایک بزم ادب قائم ہوئی۔ پھر کچھ دنوں کے بعد اس کا نام "انجمن فروغِ ادب" ہوگیا۔ خمار انصاری صاحب اس انجمن کے پہلے سکریٹری اور محفوظ الحق علمی صاحب اس کے پہلے صدر تھے۔ ۱۹۴۹ء میں خمار صاحب مستقلاً کراچی چلے گئے۔ انجمن کے نئے انتخابات ہوئے حکیم شمس الحسن اختر صاحب کو صدر اور راقم الحروف کو سکریٹری منتخب کیا گیا۔ سلیم قیصر، خالد علیگ، بہتر اجمیری، ن۔م نیازی، مقبول صدیقی، اقبال قریشی اور عزمی صاحب عاملہ کے رکن تھے۔ ان تمام حضرات کی کوششوں سے اپریل ۱۹۵۰ء میں وسیع پیمانے پر سہ روزہ اردو سندھی ادبی کانفرنس کا انعقاد کیا گیا جس کا افتتاح بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق نے کیا۔ یہ کانفرنس سابق صوبہ سندھ میں اپنی نوعیت کی سب سے پہلی ادبی کانفرنس تھی۔ شرکا میں علامہ ساحل بلگرامی۔ حضرت قمر جلالوی۔ حکیم اسرار احمد کریوی۔ ماہر القادری، اظہر گیلانی، جمیل الدین عالی، ادیب سہارنپوری، خمار انصاری۔ حکیم راغب مرادآبادی، مشتاق مبارک، آذر، مجاز، یکتا امروہوی رفیع عالم، فرخ درد، محوی منظفر نگری، دیوان لطیف، دیوان شمشاد، اور قدسی صاحب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

دسمبر ۱۹۵۳ء میں سکھر کے سندھی اور اردو کے اہلِ قلم کی مشترکہ کوششوں سے

دوروزہ سندھ ادبی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا۔ اے۔ کے بروہی صاحب نے اس کانفرنس کا افتتاح فرمایا۔ مولٰنا عبدالمجید سالک، شوکت تھانوی، شیخ ایاز، اور بہی دیگر نے اردو سندھی نشستوں کی صدارت کے فرائض انجام دیئے۔ ابراہیم جلیس، صہبا لکھنوی خمار انصاری، شاعر لکھنوی، محشر بدایونی، خالد علیگ، کرار نوری، حمایت علی شاعر، خیال بیتابی حسن حمیدی، ساغر صدیقی اور رزم آرا نے اردو کے نمائندوں کی حیثیت سے اور محمد اسمٰعیل عرسانی، تاج صحرائی، بشیر موریانی، اظہر گیلانی، احسن الہاشمی، شاہ محمد راہی نورالدین سرکی، شیخ راز، عالم عباسی، مقبول صدیقی، سلیمان شاہ سالم، اور کشور کھوجا نے سندھی نمائندوں کی حیثیت سے شرکت کی۔

سندھی ادبی کانفرنس کے بعد "ادبی سرکل" "ادبی سنگت" اور "ادبستان" کا قیام عمل میں آیا۔ "ادبی سرکل" کا مقصد ہفت روزہ تنقیدی نشستوں کا قیام اور کچھ اشاعتی کاموں میں حصہ لینا تھا۔ "ادبی سنگت کے قیام میں مقبول صدیقی، رشید بھٹی اور شیام کمار کی کوششوں کو بڑا دخل تھا۔ اور اس کی بنیاد سندھی ادب کی ترقی و ترویج کے لئے رکھی گئی تھی۔ اس مقصد کے لئے وسیع پیمانے پر "یوم سچل سرمست" کے موقعہ پر سندھی کانفرنس کی گئی۔ "ادبستان" کو بنانے سنوارنے میں حکیم شمس الحسن اختر، مہر الٰہی شمسی، خالد علیگ، حسن حمیدی، بہادر یار خاں اور مسعود بریلوی (سکریٹری ادبستان) کی کوششیں نمایاں تھیں۔

جون ۱۹۵۵ء میں ادبستان سکھر نے بڑے پیمانے پر ایک ادبی اجتماع کیا۔ انہیں دنوں پاک کلچرل سوسائٹی بنائی گئی۔ اس سوسائٹی نے شاندار طریقے پر "یوم اقبال" اور پھر "یوم قلیچ بیگ" منایا۔ مظہر جمیل اس سوسائٹی کے روح رواں تھے۔

۱۹۵۶ء اور ۱۹۵۷ء میں مہر الٰہی شمسی اور نکہت بریلوی کی کوششوں سے دو عظیم الشان پاک و ہند مشاعرے ہوئے۔ ان مشاعروں میں برصغیر کے جو نامی گرامی

شعراء شریک ہوئے ان میں جگر مرادآبادی، فیض احمد فیض، روش صدیقی، احسان دانش، قتیل شفائی، ناصر کاظمی، نریش کمار شاد، عارف عبدالمتین، ظہیر کاشمیری، حسن عابدی، راز مرادآبادی، سید محمد جعفری، ظریف جبلپوری اور شوکت تھانوی صاحب کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

حلقۂ ادب اسلامی سکھر:۔ یہ ادبی حلقہ مخصوص قسم کی ادبی نشستوں کیلئے عزیز حمیدی (ناظم)، نجیب صدیقی، نجم الاسلام، زبیر بن عمر اور ظہور صدیقی نے قائم کیا تھا۔

ہونہار لیگ:۔ نوجوان طالب علموں میں ادبی ذوق پیدا کرنے کے لئے صدیق پیامی (سکریٹری)، نجم الحسن رضوی، جاوید عمر اور ضیا ندیم نے ہونہار لیگ بنائی۔

سکھر کی قابلِ ذکر ادبی انجمنوں اور تعلیمی اداروں کی ادبی سرگرمیوں کے علاوہ روہڑی اور گھوٹکی جیسی چھوٹی چھوٹی بستیوں میں بھی اکثر بڑے بڑے ادبی اجتماعات ہوتے رہتے ہیں۔ روہڑی سیمنٹ فیکٹری کے ثقافتی مرکز "المنظر" میں سالانہ مشاعرے بڑے اہتمام سے ہوا کرتے ہیں اور اقبال قریشی ان مشاعروں کے انعقاد میں ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں۔

روہڑی شریف میں جمیل جبلپوری، سیف زیدی، اختر شاہجہاں پوری، اور ڈاکٹر نفیس کی کوششوں سے ادبی مشغلے جاری ہیں اور گھوٹکی میں جمعیت الشعرائے سندھ کے سکریٹری اظہر گیلانی ادبی اجتماعات اور اشاعتی کاموں میں خاصی دلچسپی لیتے ہیں۔

لطیف اکیڈمی سکھر:۔ یہ اکیڈمی شیخ راز، شیخ ایاز، حکیم شمس الحسن اختر، شاہزادہ ایاز، مہرالہی شمسی، منظور مرزا، نکہت بریلوی، اور ن۔م نیازی صاحب کی کوششوں سے قائم ہوئی تھی۔ شیخ عبدالرزاق راز اس کے چیرمین تھے۔ اور راقم الحروف اعزازی سکریٹری۔ جنوری ۱۹۵۸ء میں اس اکیڈمی کے زیرِ اہتمام ادبی و ثقافتی کانفرنس ہوئی جس میں شاہد احمد دہلوی، حفیظ ہوشیارپوری، شان الحق حقی، جمیل الدین عالی، صبا اکبرآبادی، تنویر عباسی اور دیگر نامورانِ ادب کے علاوہ ثقافتی نشستوں میں پاکستان کے چند ممتاز موسیقار بھی شریک ہوئے۔

ادبی سوسائٹی اس سوسائٹی کے قیام وعمل میں حکیم شمس الحسن اختر۔ ن۔م نیازی، محمد عثمان خاں قہر، اور بلیغ الرحمان صاحب نے نمایاں حصہ لیا۔ یہ ادبی سوسائٹی نے کئی سال تک ہفت روزہ تنقیدی نشستوں کا اہتمام کیا۔

سنہ ۱۹۵۹ء میں جب پاکستان کی تمام زبانوں کے اہلِ قلم کی مشترکہ کوششوں سے ادارہ مصنفین پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو ملک کے تمام ادبی مرکزوں پر اس کا اثر پڑا۔ سکھر میں بھی اس ادارے کا ذیلی حلقہ قائم ہوا جس کا تفصیلی ذکر آئندہ سطور میں آئیگا۔

ڈسٹرکٹ کلچرل ایسوسی ایشن اور مہران کلچرل سینٹر

سکھر کے موجودہ ڈپٹی کمشنر جناب جمشید رضا رالرحیم کا یہ کارنامہ ادبی وثقافتی سرگرمیوں سے دلچسپی لینے والوں کے لئے ناقابلِ فراموش رہے گا کہ موصوف نے المہران ڈسٹرکٹ کلچرل ایسوسی ایشن کے ثقافتی مرکز "مہران کلچرل سنٹر" کی تعمیر وتکمیل میں کلچرل ایسوسی ایشن کے صدر کی حیثیت سے نمایاں حصہ لیا۔ اس سلسلے میں ایسوسی ایشن کے سکریٹری سید حسن میاں صاحب روہڑی سیمنٹ فیکٹری کے جنرل منیجر جناب مصباح الحق انصاری، چیف انجنیئر جناب محمود اختر، سکھر میونسپلٹی کے الکٹریکل انجنیئر جناب سلیم معینی اور سابق چیف آفیسر جناب نور اللہ کی خدمات بھی لائقِ ستائش ہیں۔

اس ثقافتی ادارے کے زیرِ اہتمام سنہ ۱۹۶۰ء اور سنہ ۱۹۶۱ء میں دو تین بہت بڑے ثقافتی اجتماعات ہوئے جن میں پاکستان، ایران، امریکہ اور بھارت کے باکمال فنکاروں نے حصہ لیا۔ "المہران" گذشتہ دو تین سال سے ادبی وثقافتی سرگرمیوں کا بہت بڑا مرکز ہے۔

مجلسِ ادب سکھر گذشتہ دو ڈھائی سال سے کئی قسم کی ادبی خدمات انجام دے رہی ہے۔ اس مجلس کی داغ بیل محمد ایوب قریشی صاحب کی

قیامگاہ پر ایک مشاعرے میں ڈالی گئی جو مجلسِ ادب کے سابق صدر نظام الدین نعمانی صاحب کی زیرِ صدارت منعقد ہوا تھا۔ مسلم شمیم اس کے پہلے سکریٹری منتخب کئے گئے تھے۔ ان کے لاڑکانہ چلے جانے کے بعد حسن حمیدی کو سکریٹری چُنا گیا اور سید حسن میاں اس کے صدر منتخب ہوئے۔ ڈاکٹر عقیل طاہر قدوائی، علامہ حمید عظیم آبادی، شیخ عبدالرزاق رازؔ، مبارک حسین سرورؔ، عبدالرحمٰن ابرؔ، مظہر جمیل، ظہور صدیقی، اور راقم الحروف کی عملی جدوجہد سے مجلس کے زیرِ اہتمام ایک سہ ماہی ادبی جریدہ "جامِ جم" بھی نکلتا ہے۔ اب تک اس کے چار شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ حمیدؔ عظیم آبادی صاحب اس سہ ماہی جریدے کے مدیرِ اعلیٰ ہیں۔

ماہانہ مشاعروں، تنقیدی نشستوں اور مخصوص اجتماعات کے علاوہ مجلس نے بڑے پیمانے پر پاک و ہند مشاعرے بھی کئے ہیں جن میں پاکستان کے نامی گرامی شعراء کے ساتھ جن بھارتی شاعروں نے شرکت کی ان میں معین احسن جذبی۔ انور صابری اور امید ڈبائیوی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

مرکزِ ادب سکھر کے قیام کو ابھی مشکل سے ایک سال ہوا ہے۔ اس ادبی تنظیم میں جو حضرات پیش پیش ہیں ان میں سے چند کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ ریاست علی خاں (صدر)، قیوم نظر متھراوی (سکریٹری)، مہدی حسن، سید پیلی بھیتی جہانگیر عادل، اور ادریس احمد صاحب۔ گذشتہ دنوں مرکزِ ادب کے زیرِ اہتمام ایک شاندار مشاعرہ ہوا جس میں سراج الدین ظفرؔ، ساقی جاوید، فرید جاوید، اور شبنم رومانی وغیرہ نے شرکت کی۔

خیر پور قیامِ پاکستان سے پہلے بھی ریاست خیر پور کو ایک قابلِ ذکر ادبی مرکز کی حیثیت حاصل تھی اور والیانِ خیر پور کی ادب نوازی کا چرچا دور دور تک تھا۔ فرمانروایانِ خیر پور میں کئی صاحبِ دیوان شاعر پائے جاتے ہیں۔ اردو، سندھی اور فارسی

تینوں زبانوں کے ادب پر انہیں بڑا عبور حاصل تھا اور ان تینوں زبانوں میں شاعری کرنا اپنا خاندانی ورثہ سمجھتے تھے۔

ریاست خیرپور میں ایک جگہ کا نام درآزا ہے جہاں سچل سرمست نے اپنی شاعری کا جادو جگایا تھا۔ سچل سرمست سندھی، اردو، فارسی اور سرائیکی کے بہت اچھے شاعر مانے جاتے ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد ریاست کے وزیرِ اعلیٰ جناب ممتاز حسین قزلباش کی سرپرستی میں مولینا نسیم امروہوی، علامہ ساحل بلگرامی، مولینا شبیہ الحسنین، میر علی مردان، رفیع عالم، یکتا امروہوی، منظر عالم، حضور احمد، ڈاکٹر عباس، اور خاور نگرامی کی کوششوں سے نیا ادبی ماحول پیدا ہوا۔ "فیض محل" میں سالانہ مشاعرے ہونے لگے اور فروری ۱۹۵۱ء میں وسیع پیمانے پر اردو کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ اس کانفرنس میں بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق، ڈاکٹر محمود حسین خاں، علامہ آرزو لکھنوی، سید آل رضا، سید محمد تقی، رئیس امروہوی، رفیق خاور، پیر حسام الدین راشدی، جلیل قدوائی، سراج الدین ظفر، شبنم رومانی، راغب مرادآبادی، ساحر عباسی، اور خورشید اعجاز وغیرہ نے شرکت کی۔

ادبستانِ خیرپور سنہ ۱۹۵۴ء میں حسن حمیدی، ڈاکٹر اعزاز نذیر، ڈاکٹر عباس، زخم بدایونی ظفر نقوی، مہدی حسن اور اسحاق عباسی وغیرہ نے ادبستان کی بنیاد ڈالی۔ میر علی مردان کو اس کا صدر اور حسن حمیدی کو سکریٹری منتخب کیا گیا۔

ادبستان کے زیرِ اہتمام تنقیدی نشستوں کی ابتدا ہوئی اور ایک عمدہ لائبریری کا قیام عمل میں آیا۔ خیرپور میں کئی ادبی اجتماعات اس ادبی ادارے کے زیرِ اہتمام ہوئے۔

خیرپور میں جمعیت الشعرائے سندھ کے زیرِ اہتمام پروفیسر عطا محمد حامی کی کوششوں سے ایک بہت بڑی کانفرنس ہوئی تھی جس میں سندھی کے قریب قریب تمام اہلِ قلم شریک ہوئے تھے۔

لاڑکانہ جمعیت الشعرائے سندھ کی سرگرمیوں کے علاوہ یہاں عرصہ سے بزم ادب لاڑکانہ بڑی مستقل مزاجی سے ادبی خدمات انجام دے رہی ہے۔

صمد رضوی ساز اس بزم کے صدر ہیں اور اراکینِ خصوصی میں دلیوان لطیف، حکیم شہید، شعور صدیقی، شوکت عابدی، مسلم شمیم، عزیز الحسنین، سید کھائی، جمال بخاری، عرشی کرتپوری، ماہر اور کاظمی صاحب شامل ہیں۔

بزم ادب نے شعر و ادب سے ذوق رکھنے والوں کے لئے ایک لائبریری قائم کی ہے جس میں کئی ہزار کتابیں ہیں۔ ماہانہ ادبی نشستیں بڑی باقاعدگی سے ہوتی ہیں اور ہر سال بڑے پیمانے پر ایک ادبی اجتماع کا انعقاد ہوتا ہے۔ پاکستان کے جو اہلِ قلم ان اجتماعات میں شرکت کر چکے ہیں، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ احسان دانش۔ جمیل الدین عالی، طفیل احمد جمالی، ادیب سہارنپوری، منظر حیدر آبادی، حمایت علی شاعر کرار لوزی، عبدالکریم گدائی، قمر جلالوی، حسن حمیدی، خالد علیگ، بیربل جبلپوری۔ بشیر موریانی، تاج صحرائی، زخم بدایونی، حکیم شمس الحسن اختر، نظر جعفری، نکہت بریلوی مظہر جمیل، مسعود بریلوی، خاور نگرامی، عاشق کیرالوی، ظہیر سہسوانی اور عبدالحمید صبر، لاڑکانہ کے ایک قصبہ نصیر آباد کو ادارہ ادبیات اردو کے قیام و عمل سے بڑی اہمیت حاصل ہو گئی ہے یہ ادارہ رانا بھگوان داس بھگوان نے قائم کیا ہے۔

جیکب آباد میں انجمن فروغِ ادب بڑی مستعدی سے ادبی کاموں میں بڑی دلچسپی لیتی رہی ہے۔ عبدالکریم گدائی۔ کاظمی، ذکی بریلوی، نگہت عارف گوپال پروانہ، برکت آزاد، درباری لعل اور خورشید منظر وغیرہ انجمن کے بڑے سرگرم کارکن ہیں۔ انجمن فروغ ادب کے تحت کئی ادبی اجتماعات ہو چکے ہیں۔

شکارپور انجمن فروغِ ادب اور گورنمنٹ کالج کی بزم ادب سے یہاں بھی بڑی ادبی چہل پہل رہی ہے۔ عام ادبی نشستوں اور مشاعروں وغیرہ کے

علاوہ اب تک کئی بڑے ادبی اجتماعات بھی ہو چکے ہیں۔

نوابشاہ کی ادبی سرگرمیاں اور فرشوری بدایونی لازم و ملزوم ہیں۔ خیرپور ڈویژن کے دوسرے شہروں کی طرح یہاں بھی سندھی اور اردو کے اہلِ قلم مل جل کر ادبی کاموں میں حصہ لیتے ہیں۔ کئی قابلِ ذکر اجتماعات ہو چکے ہیں جن میں بابائے اردو اور پاکستان کے بہت سے نامورانِ ادب شریک ہو چکے ہیں۔

ادارۂ مصنفین اور ذیلی حلقۂ سکھر

جنوری ۱۹۵۹ء میں اِدارۂ مصنفین پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ اور جون ۱۹۵۹ء میں اس کے سکریٹری جنرل جناب قدرت اللہ شہاب و افسر رابطہ جناب جمیل الدین عالی نے کراچی، لاہور اور ڈھاکہ کے علاوہ پاکستان کے پندرہ بڑے شہروں میں ذیلی حلقے قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ سکھر کے لئے شیخ ایاز اور راقم الحروف کو کنوینر بنایا گیا۔

اگست ۱۹۵۹ء میں ہم نے ذیلی حلقے (SUB-REGION) کی داغ بیل ڈالی اور اس طرح سکھر کو یہ فخر حاصل ہوا کہ یہاں سب سے پہلے گلڈ کے سب ریجن کا قیام عمل میں آیا۔ اس وقت عالی جی نے ایک خط میں لکھا تھا "پاکستان کے پندرہ بڑے شہروں میں سکھر وہ پہلا شہر ہے جہاں مناسب، جلد اور بے شکایت کام ہوا ہے۔"

گذشتہ تین سال میں سکھر سب ریجن کے زیر اہتمام جو ادبی نشستیں، مذاکرے اور بڑے اجتماعات ہوئے ان میں شریک والوں میں بابائے اردو مولوی عبدالحق، سید وقار عظیم کومی غلام مصطفےٰ، صوفی تبسم، سید محبوب العالم، غلام عباس، شاہد احمد دہلوی، ڈاکٹر غلام جیلانی برق، شور علیگ، جمیل الدین عالی، ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، عبدالکریم گدائی، ہاجرہ مسرور، عائشہ عمر، رشیدہ عنایت، طفیل احمد جمالی، اختر انصاری اکبر آبادی، صہبا لکھنوی، الور، ظہور نظر، ناصر کاظمی، سرور بارہ بنکوی، صلاح الدین احمد، حمایت علی شاعر

ریاض انور، حضور احمد سلیم، احمد علی، ارشد ملتانی، عرش صدیقی، حبیب کیفوی، عبدالستار اور ڈیپلائی صاحب کے نام آتے ہیں۔

اس سال ماہ نومبر میں ہم ایک سہ روزہ اجتماع مصنفین کا انعقاد کرنے والے ہیں امید ہے کہ مجوزہ اجتماع پچھلے تمام اجتماعات سے زیادہ وسیع پیمانے پر ہوگا۔

ادبی نشستوں اور اجتماعات سے قطع نظر ہم نے اشاعتی کاموں کی طرف بھی خاصی توجہ دی ہے۔ اشاعتی منصوبے کے تحت ہم ایک کتاب پہلے شائع کر چکے ہیں اور تین کتابیں اسی ماہ اگست ۱۹۶۲ء میں شائع کر رہے ہیں۔

سکھر میں "گلڈ ہاؤس" قائم ہونے کے امکانات اب بھی روشن ہیں۔ امید ہے کہ عنقریب ہمیں مقامی میونسپلٹی سے ایک ایسی بنی بنائی عمارت مل جائے گی جس میں سب ریجن کا دفتر دارالمطالعہ، اشاعت گھر اور مہمان خانہ وغیرہ بنایا جا سکے۔

گلڈ کے سکریٹری جنرل جناب قدرت اللہ شہاب، مرکزی سکریٹری جناب جمیل الدین عالی، اعزازی خازن جناب ابنِ انشار اور ہمارے ویسٹ پاکستان ریجن کے اعزازی سکریٹری جناب قتیل شفائی کی امداد و اعانت کے ساتھ ساتھ خیرپور ڈویژن کے موجودہ کمشنر چودہری نیاز احمد اور سکھر کے ڈپٹی کمشنر جناب جمشید رضا رحیم کی ہمدردیاں بھی مذکورہ بالا تعمیری منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں ہمیں حاصل رہی ہیں۔

سکھر سب ریجن کی مجلسِ عاملہ میں راقم الحروف کے علاوہ جناب شیخ عبدالرزاق راز، جناب اشتیاق اظہر، جناب شاہزادہ ایاز، جناب حسن حمیدی اور جناب شیخ ایاز شامل رہے۔ اب ۲۶ اگست کو مجلسِ عاملہ کا نیا انتخاب ہونے والا ہے۔ موجودہ مجلسِ عاملہ کے تمام اراکین نے جس خلوص و محبت سے ہمارے تعمیری منصوبوں میں دلچسپی لی اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔

سکھر سب ریجن کا اشاعتی منصوبہ

اور

"رہگزار کے موتی"

ادارہ مصنفین پاکستان ذیلی حلقہ سکھر کے اشاعتی منصوبہ کے تحت ہماری پہلی کتاب "مٹی کے دیپ" وادی مہران کی عوامی کہانیوں کے مجموعے کی شکل میں شائع ہوئی تھی اس کتاب کو ادبی حلقوں میں خاصا پسند کیا گیا۔ ساتھ ہی "ادب لطیف" افکار، نئی قدریں لیل و نہار اور چند دوسرے ادبی جریدوں میں اس پر جو تبصرے شائع ہوئے۔ انہیں دیکھ کر ہمیں یہ ہمت ہوئی کہ ہم محدود پیمانے پر اس اشاعتی کام کو جاری رکھیں۔

رہگزار کے موتی ہماری دوسری کتاب ہے، اس کتاب کو ہم تین جلدوں میں شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس کی پہلی جلد آپ کے سامنے ہے جس میں خیرپور ڈویژن کے نو۹ لکھنے والوں کی منتخبہ تحریریں شامل ہیں۔

شیخ ایاز نہ صرف سندھی کے صاحب طرز شاعر و ادیب ہیں۔ بلکہ پچھلے پندرہ سولہ ۱۵ سال سے اردو میں بھی لکھ رہے ہیں۔ حال ہی میں ان کا دوسرا سندھی مجموعہ کلام، "پونم پیری آکاس" گلڈ کے مرکزی دارالاشاعت کی طرف سے شائع کیا گیا ہے۔ شیخ ایاز کی سندھی تصانیف کے علاوہ پہلا اردو مجموعہ کلام "بوئے گل نالہ دل"، ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا تھا اور دوسرا مجموعہ "کف گلفروش" کے نام سے عنقریب شائع ہونے والا ہے۔

طبعزاد شعری تخلیقات کے ساتھ ساتھ ایاز کے منظوم ترجموں کو بھی خاصی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ۱۹۴۷ء سے اوائل ۱۹۵۴ء تک ایاز نے اپنی بیشتر سندھی نظموں کے ترجمے کیے۔ یہ منظوم ترجمے ثقافتی ورثے کے طور پر ممتاز ادبی جریدوں میں شائع ہوتے رہے۔ ۱۹۵۵ء سے ایاز نے شاہ لطیف، سچل سرمست، چین رائے سامی اور میر عبدالحسین سانگی جیسے بلند پایہ سندھی شاعروں کے کلام کو اردو شاعری میں منتقل کرنا شروع کیا۔ سندھ یونیورسٹی کی طرف سے شاہ لطیف بھٹائی کے پورے مجموعہ کلام یعنی شاہ جو رسالو کے منظوم اردو ترجمے کا کام بھی ایاز کو ہی سونپا گیا تھا۔ شاہ کے کلام کا یہ منظوم اردو ترجمہ عنقریب منظر عام پر آنے والا ہے۔ منظوم ترجموں میں تخلیقی اپج کا بانکپن جہاں ایک طرف ایاز کی اعلیٰ شاعرانہ صلاحیتوں کو ظاہر کرتا ہے وہاں دوسری طرف سندھی شاعری کی راہ و رسم اردو شاعری سے کچھ اور بڑھا دیتا ہے۔

شاعری کی طرح ایاز کی نثر نگاری میں بھی ایک ایسا نیا پن پایا جاتا ہے جس میں بڑی معنی خیز و فکر انگیز سادگی و پرکاری ملتی ہے۔ ابتدائی دور میں ایاز نے جو افسانے لکھے تھے۔ ان افسانوں اور پچھلے دو تین سال کی تحریروں کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو حیرت انگیز تبدیلی نظر آتی ہے

حمید عظیم آبادی

دبستان شاد کے کہنہ مشق و پرگو شاعر ہیں اور بجا طور پر جانشین شاد کہے جا سکتے ہیں۔ حمید صاحب نے ۱۹۱۴ء سے اب تک جو ادبی خدمات انجام دیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ موصوف کم و بیش پندرہ سولہ کتابوں کے مصنف و مؤلف ہیں۔ عرصہ دراز تک عظیم آباد (پٹنہ) میں دبستان شاد کی علمی و ادبی شمعیں روشن کیے رہے۔ فروری ۱۹۵۶ء میں ترک وطن کر کے سکھر آئے اس وقت سے اب تک اسی شہر میں قیام پذیر ہیں۔ آپ مجلس ادب سکھر

کے بنیادی رکن اور مجلس کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والے سہ ماہی ادبی جریدے "جامِ جم" کے مدیرِ اعلیٰ ہیں۔ حال ہی میں آپ نے ڈسٹرکٹ کلچرل ایسوسی ایشن کی طرف سے شاد عظیم آبادی کے مجموعہ کلام کو "میخانہ الہام" کے نام سے دوبارہ شائع کیا ہے۔

حمید صاحب نے یوں تو مقفیٰ شاعری کی قریب قریب تمام اصناف پر طبع آزمائی کی ہے لیکن خاص رغبت غزل گوئی سے ہے۔ موصوف کی غزلوں میں ویسے تو ان تمام روایاتِ تغزل کا رچاؤ موجود ہے۔ ولی، میر، درد، مصحفی، آتش، ناسخ، ذوق، غالب، اور اس کے بعد کے بلند پایہ اساتذہ کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر آپ نے خواجہ میر درد اور شاد عظیم آبادی کا زیادہ اثر قبول کیا ہے۔

"حمید صاحب مختلف ادبی کاموں اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہنے والے بزرگ ہیں۔ اگلے وقتوں کے یہ لوگ پرانی شراب کی طرح قیمتی ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے خاص فن میں جو ریاض کیا ہے اس کا عشر عشیر بھی نوجوان فنکاروں کو میسر نہیں۔"

فنِ عروض سے موصوف کو بڑی دلچسپی ہے اور اس فن پر کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ مجموعہ کلام زیرِ ترتیب ہے اور مستقبل قریب میں مجلس ادب سکھر کی طرف سے شائع ہونے والا ہے۔

شاہزادہ آیاز کئی افسانوی مجموعوں کے مصنف ہیں ان کے افسانوی مجموعوں میں "برہنہ شرم" "کولہو کے بیل" اور "نئی کروٹ" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ موصوف قیامِ پاکستان سے پہلے کئی سال کانپور اور بمبئی میں ایک صحافی کی حیثیت سے اپنی تحریروں کا جادو جگاتے رہے۔ پھر فلم سازی

کی طرف رجوع ہوئے اور اس میدان میں بھی خاصی شہرت حاصل کی ۱۹۴۷ء سے
اب تک سکھر ہیں ہیں۔ صحافت اور افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ درسی کتابوں کی
تصنیف و تالیف میں بھی انہوں نے بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اب تک آٹھ دس
درسی کتابیں لکھ چکے ہیں۔

شاہزادہ آیاز کے افسانے زبان و بیان کے اعتبار سے خاصے دلچسپ ہوتے ہیں
انہوں نے اکثر زندگی کے بیحد اہم مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔
ان کے افسانوں کی حقیقت نگاری پر محض جذباتیت کی ہی چھاپ نہیں پڑی ہے
بلکہ اصلاح پسندی کے رجحانات بھی نمایاں ہیں۔

معاشرتی بے راہ روی، نفسیاتی الجھنوں، فسادات، اور سیاسی انتشار
پر ایاز نے کچھ ایسی عدیم المثال کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ جن کو ان کی نمائندہ کہانیاں
کہا جا سکتا ہے۔ ان کہانیوں میں شجر ممنوعہ، بھونچال، زرد تنکے اور مردوں کے
دوش بدوش خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

صمد رضوی ساز ایک اچھے نظم گو شاعر ہی نہیں اچھے تمثیل نگار بھی ہیں۔ قیام
پاکستان سے پہلے حیدر آباد دکن میں جامعہ عثمانیہ کے ادبی
ماحول نے ساز کی شعری صلاحیتوں کو اجاگر کیا۔

مخدوم، وجد اور میکش مرحوم ان کے ساتھیوں میں تھے۔ حیدر آباد دکن کی
عوامی تحریکوں کے ایک سرگرم رکن کی حیثیت سے بھی ساز صاحب
خاصے مشہور ہوئے۔ پاکستان بننے کے بعد سے اب تک لاڑکانہ میں سکونت پذیر ہیں
اور بزم ادب لاڑکانہ کے مستقل صدر ہیں۔

"ساز کی شاعری میں حسن و عشق کا خوشگوار امتزاج پایا جاتا ہے تخیل کی بلندی
زبان کی شیرینی، حسین تشبیہات اور استعارات کے ساتھ ان کے کلام میں ایک

کیف آور نغمہ بھی ہے، شورش بزم حیات میں دوست کی قربت ان کو سب سے زیادہ عزیز ہے۔ اور وہ ہمیشہ دوست کے ہو کر زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ کیوں کہ یہی ان کے سکون و مسرت کا سرچشمہ ہے۔"

ساز زبان میں لطافت، ترکیبوں میں، شیرینی اور ترنم لیے ہوئے اپنا نغمہ سناتے ہیں۔ ان کا دل دنیا کی کثافتوں سے دور عشق کی پاک سرزمین میں رہتا البتہ نظر آتا ہے۔ یہی اثر ہے کہ ان کے نغمے آبشار کی طرح بہتے ہیں اور ہر زمین میں نئے انداز سے اپنے بہاؤ کا ایک ہی راستہ نکال لیتے ہیں۔

شیخ عبدالرزاق راز سندھی کے مشہور ادیب و شاعر اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی کتابوں میں ان کا پہلا مجموعہ کلام سارنگ، افسانوں کا مجموعہ ڈاک بنگلہ۔ ایک ناولٹ، فاتح سندھ، اردو میں سندھ کی عوامی کہانیوں کا مجموعہ "ماروی کے دیس میں"، اور انگریزی میں (Sukkur Past and Present) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ طبعزاد ادبی کتابوں کی تصنیف کے ساتھ ساتھ ادب اور تاریخ کی درسی کتابوں کی تالیف بھی ان کے مشاغل میں شامل ہے

شیخ راز نے زیادہ تر اردو میں ایسے مضامین لکھے ہیں جن کو پڑھ کر ہمیں سندھی ادب کے متعلق کافی معلومات حاصل ہو جاتی ہے۔ سندھ کا بیراگی شاعر، سندھ کا سرمست، سندھ کا شاہزادہ شاعر اور روہڑی کے دو درویش اسی قسم کے مضامین ہیں جو سندھی کے مشہور و معروف شاعروں کی شخصیت اور کلام پر لکھے گئے ہیں۔ ان مضامین کی زبان بڑی سادہ و سلیس ہے۔ حال ہی میں انہیں منظوم اردو ترجموں اور اپنے افسانوں کو اردو میں منتقل کرنے کا شوق پیدا ہوا ہے۔ کچھ منظوم ترجمے اور ان کا ایک افسانہ اس کتاب میں بھی شامل ہیں۔ افسانہ کے ساتھ زیادتی

یہ ہوئی ہے کہ صفحات کی کمی کے باعث اسے کافی مختصر کرنا پڑا ہے۔ اور اس میں وہ حسن باقی نہیں رہ سکا ہے جو ان کے سندھی افسانے میں ہے۔

مراد نے سندھی شاعری میں اپنی آزاد نظموں سے قابل قدر اضافے کیے ہیں۔ نظم آزاد اور نظم معریٰ کی حمایت میں ان کے کئی مقالے بھی سندھی جریدوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

اشتیاق اظہر ایک صحافی، ادیب اور غزل گو شاعر کی حیثیت سے برصغیر کے ادبی حلقوں کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ مولانا حسرت موہانی سے نہ صرف شاعرانہ طور پر بلکہ ادبی و سیاسی سوجھ بوجھ کے معاملے میں اظہر صاحب کو جو تعلق خاطر رہا ہے اس کا اثر ان کی غزلوں پر بہت زیادہ پڑا ہے۔ حسرتؔ کی طرح اظہرؔ کی غزلوں سے بھی "تہذیبِ رسمِ عاشقی" کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کی غزلوں کا ایک مجموعہ "نغمہ و شعر" ۱۹۵۹ء میں شائع ہو چکا ہے اور دوسرا مستقبل قریب میں شائع ہونیوالا ہے۔

اظہر صاحب کی غزلوں میں تغزل کی قدیم و جدید اقدار کا بڑا خوشگوار امتزاج ہے ان کے لہجے میں کہیں بھی جھنجھلاہٹ اور تلخی پیدا نہیں ہوتی۔ موقع و محل کی مناسبت سے نرم و نازک الفاظ، شگفتہ ترکیبیں اور عام فہم تشبیہات و استعارات نے ان کی غزل گوئی کو ایک مخصوص مزاج عطا کیا ہے۔ فراق ہو یا وصال ان کے اس مزاج کی یکسانیت خالص شاعرانہ انداز بیان کو پیش نظر رکھتی ہے۔ غم جاناں کی چھاپ ان کی غزلوں پر کچھ اتنی گہری ہے۔

کہ اول تو غم دوراں کا ذکر ہی کم ملتا ہے اور جہاں کہیں بھی ملتا بھی ہے تو کچھ اس طرح کہ غم ملا اسے غم جاناں بنا دیا۔

اظہر صاحب اپنی غزلوں کے لئے بڑی مترنم بحریں منتخب کرتے ہیں اور مشکل سے

مشکل زمین میں بڑے دل آویز شعر کہہ جاتے ہیں۔

حسن حمیدی مشہور شاعر و ادیب بھی ہیں اور ادبی کارکن بھی ہیں۔ پہلے ادبستان خیرپور کے سکریٹری تھے۔ اب مجلس ادب سکھر کے سکریٹری اور ادارۂ مصنفین پاکستان کی مرکزی عاملہ کے رکن ہیں۔ وادیٔ مہران کے شاعر آتش نوا کی حیثیت سے انقلابی نظمیں کہتے ہیں اور بہت خوب کہتے ہیں۔ حسن صاحب تنقیدی مضامین لکھنے کی بڑی اچھی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور ان کے کئی تنقیدی مضامین مختلف ادبی موضوعات پر شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کی شاعری کی عمر ویسے تو قریب قریب سترہ اٹھارہ سال ہے لیکن گذشتہ سات آٹھ سال میں انھوں نے جو نظمیں کہی ہیں ان میں فکر و فن کا بڑا متوازن امتزاج ہے۔ ان کی جدید مطبوعہ نظموں میں تیل کے رواں چشمو، بری سی بات، ایک صدی پہلے ایک صدی بعد، ہمسفرو، فکر نو، مرگ احساس، اب نئی صبح مسکرائے گی، قہقہوں کا زہر، اور شہر بدر نمائندہ نظمیں ہیں۔ اپنے مخصوص رنگ میں کبھی کبھی غزلیں بھی کہتے ہیں، لیکن غزل گوئی سے انہیں کوئی خاص رغبت نہیں۔

حسن حمیدی ایک باشعور شاعر کی حیثیت سے زندگی کی مثبت اقدار پر ایمان رکھتے ہیں۔ فن کی عظمت نئے شعور اور روایات کی اہمیت کے قائل ہیں، ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ، شرار جستہ کے نام سے بہت جلد منظر عام پر آنے والا ہے۔

منظر ایوبی پسندیدہ شاعر و ادیب ہیں۔ پہلے کراچی میں گلڈ کے ماہنامہ "ہم قلم" سے وابستہ تھے لیکن گذشتہ ایک سال سے گورنمنٹ ڈگری کالج شکارپور میں اردو کے پروفیسر ہیں۔ اس لئے اب انہیں بھی ہم اس ریگزار کے موتیوں میں گنتے ہیں۔ منظر صاحب غزلگوئی کی بھی بڑی اچھی صلاحیتیں رکھتے ہیں اور نظم جدید کی تخلیق میں بھی بڑے فنی رکھ رکھاؤ سے کام لیتے ہیں۔ علاوہ ازیں مقالہ نگاری

کے فن میں بھی انہیں خاصی مہارت حاصل ہے۔ ان کی غزلوں میں تغزل کے جدید لب و لہجے اور نئے شعوری ارتقاء کی علامات بھی ہیں اور قدیم تہذیبی روایات کے اشارات بھی۔ غمِ عشق بھی اور غمِ روزگار بھی۔ لیکن کچھ ایسے خوشگوار توازن کے ساتھ کہ ان کی غزلیں فکر و فن کے حسین امتزاج کا مظہر کہی جا سکتی ہیں۔ نظموں میں جدید نظم گو شعراء ہئیت و مواد کے جو تجربے کر رہے ہیں کچھ ویسے ہی تجربے اپنے تغزل پسند مزاج کے مطابق انہوں نے بھی کئے ہیں۔ ان کی نظموں کے موضوعات بھی زیادہ تر وہی ہیں۔ جن پر پچھلے چند سالوں میں ہر قسم کی نظمیں لکھی جاتی رہی ہیں چونکہ اس کتاب میں ہم نے ان کا ایک مقالہ بھی شامل کیا ہے اس لئے منظومات کیلئے گنجائش بہت کم رہ گئی۔ اس کی تلافی یقیناً ان کے مجموعہ کلام سے ہو جائیگی جو عنقریب شائع ہونے والا ہے۔

رہگزار کے جن موتیوں کی آب و تاب اس پیشکش میں آپ کو نظر آئے گی ان میں سے ایک موتی ہونے کا حقدار میں نے اپنے آپ کو بھی بنایا ہے۔ میرے لئے دوسروں کی تعریف میں کچھ لکھنا جتنا آسان ہے اس سے کہیں زیادہ دشوار یہ ہے کہ میں اپنے بارے میں بذاتِ خود کچھ لکھوں لیکن کچھ نہ کچھ لکھنا ضرور چاہتا ہوں یہ کچھ نہ کچھ کا معاملہ بڑا پیچیدہ ہے۔

سنہ ۱۹۴۲ء سے میں نے کچھ نہ کچھ لکھنا شروع کیا اور اسی وقت سے ایک ادبی کارکن بننے کا شوق بھی پیدا ہوا۔ سنہ ۱۹۴۷ء میں سکھر آنے کے بعد یہ شوق کچھ اور سوا ہو گیا۔ یہاں کی ادبی سرگرمیوں میں ایک ادبی کارکن کی حیثیت سے اپنی شمولیت کو اس لحاظ سے بڑی اہمیت دیتا ہوں کہ ان کی بدولت اس شہر کا شمار پاکستان کے قابل ذکر ادبی مرکزوں میں ہونے لگا ہے۔

بوادیٔ کہ دراں خضر را عصا خفتہ است
بسینہ می سپرم راہ گرچہ پا خفتہ است

آفاق صدیقی
اعزازی سکریٹری بزم سخن سکھر

شیخ ایاز

نام :- شیخ مبارک ۔ تخلص :- ایاز ۔ وطن :- شکارپور (سندھ)

پیدائش :- ۱۹۲۲ء تعلیم :- بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

موجودہ پتہ :- کوئنس روڈ سکھر

مشاغل

صدر مجلسِ استقبالیہ اردو سندھی ادبی کانفرنس (۱۹۵۳ء) صدر سندھی ادبی سرکل (۵۳ء تا ۵۵ء) صدر مجلسِ استقبالیہ ادبی و ثقافتی کانفرنس (۱۹۵۶ء) رکن مرکزی مجلسِ عاملہ پاکستان رائٹرز گلڈ (۱۹۵۹ء تا ۱۹۶۲ء) صدر مجلسِ استقبالیہ اجتماع مصنفین (زیرِ اہتمام پاکستان رائٹرز گلڈ سب ریجن سکھر (جنوری ۱۹۶۱ء)

تصانیف

۱۔ سفید وحشی (سندھی افسانوں کا مجموعہ) ۲۔ پنکھ کان پوے (سندھی مجموعۂ کلام)

۳۔ بوئے گل نالۂ دل (اردو مجموعۂ کلام) ۴۔ شاہ لطیف کے مجموعۂ کلام کا منظوم اردو ترجمہ (زیرِ طبع)

۵۔ دوسرا سندھی مجموعۂ کلام (مرکزی گلڈ کے زیرِ اہتمام شائع ہو رہا ہے)

۶۔ کفِ گل فروش (دوسرا اردو مجموعۂ کلام ۔ زیرِ طبع)

تخلیقِ فن

پھر کوئی سنگ بدست آتا ہے — خانۂ شیشہ گراں کی جانب
پھر کوئی نعرۂ مستانہ بڑھا — لرزشِ کوئے اماں کی جانب

پھر کوئی شبنمِ تخئیل لیے — چہرۂ گل پہ مہکنے آیا ہے
پھر کوئی فطرت قندیل لیے — صبحِ کاذب میں دہکنے آیا ہے

پھر کوئی گردنِ مینا پہ جھکا — پھر لبِ جام کسی نے چومے
پھر نہاں خانۂ اصنام کھلا — پھر صنم زندہ ہوئے اور جھومے

پھر نگاہِ صنم افروز کوئی — سینۂ سنگ میں پیوست ہوئی
پھر کوئی تشنگیٔ صہبا ساز — تہہِ ساغر میں چھنکتی پہنچی

پھر جٹاؤں میں گھٹائیں جھومیں — اور کوئی میکدہ بردوش آیا
لبِ فردا پہ تبسم نکھرا — جب کوئی مستِ مئے دوش آیا

متلاطم ہوئی وہ تاریکی — جس کی گہرائی نہ ہوگی معلوم
ماہ و انجم کے حروفِ زریں — جس کی ہر موج پہ ہونگے مرقوم

شیخ ایاز

ترجمہ و تصنیف

رات کروٹ بدل رہی ہے دیکھ
تیری زلفوں میں ڈھل رہی ہے، دیکھ
اور اِک ساغرِ خمار آگیں
زندگانی سنبھل رہی ہے دیکھ
یہ صراحیٔ بادہ ہی اکثر
ترا نعم البدل رہی ہے، دیکھ
حسنِ گل میں کمی نہیں لیکن
زندگی خوں اُگل رہی ہے، دیکھ

ظلمتِ زیست سے الجھتا رہ
شمعِ تقدیر جل رہی ہے دیکھ
اک سحر کی تلاشِ پیہم میں
زندگی آنکھ مَل رہی ہے دیکھ
رنگ لائے گی کیا یہ روحِ عصر
کشت و خوں میں جو پل رہی ہے دیکھ
جادۂ کوہکن میں روحِ خبر
اک نئی چال چل رہی ہے، دیکھ
پرچمِ عزم کو بلند کر اور
وہ مشیّت سی ٹل رہی ہے دیکھ

راہِ طلب میں

سچل سرمست
ترجمہ
شیخ ایاز

راہِ طلب میں
طبلِ تمنا گونج رہا ہے
اہلِ سلاسل چنگ بہ لب زنجیر بہ پا ہیں
سارے غرفۂ زنداں وا ہیں

شور بپا ہے
سازِ نفس ہر ضرب صبا سے
ولولہ خیز آہنگِ صدا ہے
سینۂ گیتی شعلہ نوا ہے
طبلِ تمنا گونج رہا ہے

راہِ طلب میں
لو اب سارے رشتۂ ہستی ٹوٹ چکے ہیں
اہلِ سلاسل چھوٹ چکے ہیں
دیکھ یہ کیا ہے
فرشِ زمیں سے عرشِ بریں تک
اک طرفہ سیلابِ ضیا ہے
جس میں عالم ڈوب گیا ہے
راہِ طلب میں
طبلِ تمنا گونج رہا ہے

سچل سرمست

ترجمہ: ۔ ایاز

کافی

وہی موجِ تلاطم ہے وہی اپنا سفینہ ہے
مسلسل ہے حیات اپنی نہ مرنا ہی نہ جینا ہے
دیارِ کفر و ایماں ہے سنبھل کر چل ارے ناداں!
یہاں تو فرطِ نفرت ہی یہاں تو شرطِ کینہ ہے
ریائے زہد کیوں اس کے قریب آئے کہ میرا دل
شرابِ زیست میں ڈوبا ہوا اک آبگینہ ہے
ترا حسن خمار آگیں سرِ بازار لے آئے
یہی اپنا سلیقہ ہی یہی اپنا قرینہ ہے
در و دیوارِ مسجد زاہدِ زنداں طلب کے ہیں
مرا تو مہ بہ مہ انجم بہ انجم ایک زینہ ہے
سحر پھوٹی ریائے زہد گھر سے کو بکو نکلا
سچو ابتک مری آنکھوں میں کیوں خوابِ شبینہ ہے

چین رائے سوامی

ترجمہ :- شیخ ایاز

وہ دیکھو شبنم روتی ہے اور ساری دنیا سوتی ہے
ہر حرماں اپنا درماں ہے ہر آنسو اپنا موتی ہے
اک شب ایسی بھی ہوتی ہے جب چاند بہ پیار آجاتا ہے
جب چاند سے وحشت ہوتی ہے اک شب ایسی بھی ہوتی ہے
وہ نیند جو اڑتی رہتی ہے وہ آنکھ جو روتی رہتی ہے
وہ اس دھرتی کی شوبھا ہے وہ اس جیون کی جوتی ہے
ہے ایک حقیقت دکھ سکھ کی اس جیون کی پھلواری میں
جو غنچہ ہنستا ہے اور شبنم شبنم روتی ہے
یہ کیسی کومل تا کی لو ہے تیرے میرے بندھن میں
جو تیرا من برماتی ہے اور میری آنکھ بھگوتی ہے
اس چار پہر کی چھایا میں اے چاند کبھی تو نے سوچا
کیا تیری ہستی پاتی ہے کیا تیری ہستی کھوتی ہے
پھر سے وہ ترنم ریز صدا جو راگ بھی ہے بیراگ بھی ہے
جو سوگ بھی ہے اور جوگ بھی ہے جو داغِ تمنا دھوتی ہے
تو پاپی ہے تو پاپی ہے اے سوامی کیسا پاپ مگر
جب پاپ اسی کا پرتو ہے جو تیرے من کا موتی ہے

میر عبدالحسین سانگی

ترجمہ: شیخ ایاز

پھر وہی بادِ بہار آنے لگی
جسم و جاں سے بوئے یار آنے لگی

بدلیوں کی چھاؤں میں کیا بات تھی
یادِ جاناں بار بار آنے لگی

رُوح کی گہرائیوں سے دفعتاً
کوئی کھوئی سی پکار آنے لگی

کوئی صورت مثلِ نیرنگِ نظر
سوئے چشمِ اشکبار آنے لگی

پھر گھٹاؤں سے لپٹ کر سوئے جام
گردشِ لیل و نہار آنے لگی

میری آنکھوں سے برسنے کے لئے
کوئی رسمِ انتظار آنے لگی

مدتوں کے بعد سانگی آج پھر
زخمِ پنہاں پر بہار آنے لگی

★

رات بھر موجِ رواں پر ڈولتا
ایک چھوٹا سا دیا

★

رک گیا گہوارۂ موجِ صبا
خوشۂ گندم کی آنکھیں کھُل گئیں

★

یہ لبِ ساحل یہ ساون کا سماں
جل رہے ہیں کشتیوں میں کچھ دیئے
اُڑ رہی ہیں روشنی کی دھجیاں

★

یہ شبِ خاموش و ویراں یہ ہوا
اور ردائے تیرگی اوڑھے ہوئے
ایک جھینگر کی صدا

★

سایۂ مہتاب چرخِ نیلگوں
اور فضا میں پُرفشاں و پُرفسوں
اک پرندے کا جنوں

★

بحرِ ناپیدا کنار
ریگِ ساحل پر کئی نقشِ قدم
ہے جنہیں موجِ بلا کا انتظار

★

گرچہ چمپا کی کلی
رات بھر سوتی رہی
شورِ محشر انگیز تھا
صبح تک طوفانِ ہیبت خیز تھا

★

پھر گذشتہ رات خستہ تن خدا
میرے دروازے پہ آکر رک گیا
اور میں سوتا رہا

★

آج بادل چھٹ گئے
اور کنوئیں کی گہری تہہ میں چاند کا
عکس لہراتا رہا

○

میں نے جب محفلِ انجم کو بکھرتے دیکھا
شورشِ ہستیِ عالم کو نکھرتے دیکھا
جب دمِ صبح یہ کرنیں پھوٹیں
اور اک نور کا سیلاب امڈ کر آیا
تو مرے دل پہ ترا خواب امڈ کر آیا
خواب جو رات مری روح کو اکساتا تھا
خواب وہ جس نے مٹائی تھی مری قیدِ حدود
میں تری لذتِ آغوش کو چھو سکتا تھا
اور اس ہستیِ دلدوز کی لاکھوں چیخیں
میں تری موجِ تبسم میں ڈبو سکتا تھا
کھُل گئی آنکھ مری
جبکہ اک نور کا سیلاب اُمڈ کر آیا
اور اس ہستیِ دلدوز کی لاکھوں چیخیں
چونک اُٹھی مری مانوس سماعت جن سے
ہم زباں ہو کے یکایک گونجیں
زندگی ایک تبسم کی گراں باری ہے

○

میں ہوں ایک اکیلا مانجھی
جس نے روز نئی نیّا لی
اس جیون کا تھاہ نہ پایا
لوٹ لوٹ کر واپس آیا

نیّا نیّا مجھ کو جانے
لہر لہر مجھ کو پہچانے

اے مرے ساحل میں ترے صدقے
آج تو الجھا ہوں لہروں سے
میں نے سوچا
کیا یہ نیّا اور پتوار مجھے لے جائے گی
یونہی یہ منجدھار مجھے لے جائے گی
اس پار مجھے لے جائے گی

○

میں ہوں اک ہرجائی بھنورا
پھول پھول کو جس نے چوما
پھولوں کی بُو باس میں گزرا سارا جیون میرا
کانٹوں سے الجھا نہ کبھی بھی یعنی دامن میرا
کبھی کبھی سوچا کرتا ہوں
اس جیون کی پھلواڑی میں کانٹے کیوں ہیں
بن کانٹے پھول نہیں کھِل سکتے
کیوں ایسے باغ نہیں مِل سکتے؟

○

مرے در پہ دستک نہ دینا
مری روح انگڑائیاں لے رہی ہے
چراغِ شبستاں کی یہ جھلملاتی ہوئی لَو مجھے دور لیجا رہی ہے
بہت دور اک موجۂ نور کے پیچ و خم میں
ازل سے ابد تک جو پیہم رواں ہے
مرے دوست یہ ٹمٹماتے ہوئے دیپ اور یہ پر اسرار سائے
مری روح میں گھُل گئے ہیں
یہ شب ہائے تیرہ مری زندگی ہیں
تمہیں انتظارِ سحر ہے
مگر جانتے ہو سحر اس کڑکتی ہوئی دھوپ کا پیش خیمہ بنی ہے
جو چشمِ بصارت کو خیرہ بنا کر رہی ہے
یہ خوابِ شبستاں ہے مدھم چراغوں کے سایے تلے
زندگی کروٹیں لے رہی ہے
مجھے چلچلاتی ہوئی دھوپ میں دوڑنا تو نہیں ہے
مجھے انتظارِ سحر ہی نہیں ہے
مرے در پہ دستک نہ دینا

○

پریشاں خیالو!
مری زندگی کی خلا میں بھٹکتے بگولو
مجھے چھوڑ جاؤ مرے حشر ساماں سوالو
کہ مجھکو ذرا نیند آنے لگی ہے
کہ میرے پپوٹوں پہ انبار بیخوابیوں کے لڑھکنے لگے ہیں
یہ میری جبیں اک سلگتی ہوئی راکھ کا ڈھیر ہے
جس پہ لاکھوں سوالات اپنی شرر باریاں کر چکے ہیں
یہ جی چاہتا ہے کہ ساری تگ و دو کو گہوارۂ خامشی میں سلادوں
مری کلبلاتی ہوئی روح اس زندگی کے قفس سے
گھڑی دو گھڑی کے لئے، بھاگنا چاہتی ہے!
پریشاں خیالو!
مرے حشر ساماں سوالو
نہیں چھوڑتے تم؟
کہاں جا رہے ہیں ستاروں کے یہ اَن گنت کارواں
یہ کسی نے نہ جانا

یہ مسحور راہی کہاں جارہے ہیں؟
کسی منزلِ نور کی جستجو میں
مگر یہ تو میرا فریبِ نظر ہے
طلسمِ خیالِ بشر ہے
یہاں منزلِ نور کوئی نہیں ہے
ازل سے ابد تک کوئی جادواں تیرگی پیچ و خم کھارہی ہے
یہ دنیا یہ آماجگاہِ تمنا
کہاں جارہی ہے؟
یہ رقاصۂ روز و شب نوکِ خنجر پہ یوں ناچتی جارہی ہے
کہ جیسے اسے یہ یقیں ہوگیا ہو
کہ اب پاؤں پھسلنے نہ ہوں گے
یہ انساں کہ صیادِ روزِ ازل ہے
کہ پھینکیں ہیں کرنوں پہ جس نے کمندیں
یہ تیار کرتا ہے ہر روز ایسے انوکھے قفس کو
جسے توڑ دیتا ہے پر پھڑپھڑا کر کوئی طائرِ نیم بسمل
نہ جانے مجھے کیوں یقیں ہوگیا ہے
کہ انسان خود ایک صیدِ زبوں ہے!
پریشاں خیالو!
مرے حشر ساماں سوالو

نجانے مجھے کیوں یقیں ہو گیا ہے
کہ یہ پیکرِ خاک لاکھوں نقاب زرافشاں بدلتی رہے گی
مگر روسیاہی چھپے گی نہ اس کی
بجھا دو یہ تاروں کے قندیل
فانوس ماہِ درخشاں
تصوّر کی اس جھلملاتی ہوئی جھیل کو
تیرگی میں چھپا دو
کہ یہ روشنی میری آنکھوں کو خیرہ نہ کر دے
مجھے نیند سی آرہی ہے

○

آرزوؤں کے پھول چُن لینا
قصّہ ہائے بہار سُن لینا
اور مہکتی ہوئی فضاؤں میں
سنتے سنتے مدام سو جانا
ہے یہی اختتام سو جانا

○

دلِ یزداں نے کہا ایک خزانہ ہوں میں
کیوں نہ عالم پہ گہر پاش بنوں
پھر گل و لالۂ و شبنم کو بکھیرا اس نے
سرمئی چادرِ شب کو مہ و انجم سے بنایا زرکار
اور حسینانِ جہاں کو درِ دنداں بخشے
اسے معلوم نہ تھا
کہ گل و لالہ جگر چاک بنیں گے اک دن
اور یہ شبنم بسر اوقات کرے گی رو کر
سرِ افلاک بھٹکتا ہی رہے گا یہ چاند
اور انجم کی جھپکتی ہوئی آنکھوں میں کبھی
نیند ہو گی کہ نہیں
اسے معلوم نہ تھا ہائے کہ ہنستے ہوئے دانت
کبھی بیچارگی و غم کو دبا رکھیں گے
دامنِ دل میں کئی اشک چھپا رکھیں گے

○

میں نے انساں کے دل میں جھانکا
ایک چھوٹا سا کنواں
جس میں عکسِ مہ و انجم کے سوا کچھ بھی نہ تھا
میں نے چلو میں لیا کچھ پانی
اور بلائیں دو جہاں کی نظر آئیں مجھکو

○

یہ انساں
یہ مرغابیاں
بہتے پانی پہ سایہ کناں
پر فشاں
جا رہی ہیں کہاں
یہ فرازِ زمیں وسعتِ آسماں
یہ سہانا سماں
کتنا پُر کیف ہے یہ سفر
کاش ہوتا نہ ان کے دلوں میں
کمیں گاہ کے اک شکاری کا ڈر

○

زندگی ایک تصور کی فسوں سازی ہے
جھلملاتی ہوئی جھیلوں میں تری غوطہ زنی
تیرتے تیرتے افسوس تری دل شکنی
تو نے اے دوست جسے دور سے ساحل سمجھا
وہ تو اک موجۂ بے رو کی سکوں بیزی ہے
کہ تجھے غرقِ تہِ آب کرے گی اک دن
زندگی ایک تصور کی فسوں سازی ہے

تو نے چاہا ہے چراغ سرِ منزل بننا
تجھے معلوم نہیں ہے سرِ منزل کیا ہے
تیری نظریں تو ہیں سوئے شفقِ لالہ فشاں
اور پاؤں ہیں کہ تیزی سے بڑھے جاتے ہیں
سرِ منزل تو ہے اے دوست فقط ایک نشیب
کہ گرائے گا تجھے موت کے انگاروں پر
میں نے سیکھا لبِ ساحل سے نظارا کرنا
اور ہر منزلِ انساں سے کنارا کرنا

بزیرِ شجر آہوانِ رمیدہ
کھڑے سوچتے ہیں
حیاتِ گریزاں سراب مسلسل
ستم تشنگی حاصلِ زندگانی
یہ کیسا ستم ہے
کٹی عمر اک جرعۂ آب کی جستجو میں
کبھی ڈھلتا سورج
کہ مثلِ نگینِ خاتم ریگ میں جگمگا کر
بلاتا ہے سوئے افق ان کے قلب و نظر کو
دیارِ فلک سے کبھی ماہ و انجم
انہیں بھیجتے ہیں سلامِ تبسّم
بوقتِ طلوعِ سحر بادِ صحرا
اُڑا دیتی ہے روح کا اضطراب و تذبذب
مگر پھر وہی آفتابوں کے تیر و سناں
اور سینہ فگاروں کی جلتی ہوئی داستاں
تشنگی، جستجو، تیز لو، دشت ویراں
سراب مسلسل، حیات گریزاں
یہ کیسا ستم ہے
کٹی عمر اک جرعۂ آب کی جستجو میں

O

میں نے دیکھا ہے اسے
کون کہتا ہے کہ وہ جلوہ بہ مستورِ مرا واہمہ ہے
چاندنی راتوں کے احساسِ جمیل
تم بتاؤ کہ وہ محبوبِ حسیں
میری آغوش میں کس طرح مچل جاتا ہے
موسمِ گُل کی سلگتی شامو
تم بتاؤ کہ مرا کاشانہ
آتشِ گُل سے دہکتا ہے جب
بارشِ حسنِ دو عالم کی طرح
حلقۂ بوئے چمن سے وہ مرا پیکرِ ناز
ہائے کس طرح مہکتے لب و رخسار لئے
خلوتِ دل میں چلا آتا ہے
ہائے یہ دولت و ثروت کا پجاری یہ ہجوم
خونِ انساں کو چراغوں میں جلانے والا
تیرگی اور بڑھانے والا
کون سمجھائے اسے جلوۂ مہتاب بھی ہے
کون سمجھائے اسے
تری آنکھوں سے ترا نور تری بیداری

چھین ہی لے گی کبھی
جس سے ہو حاصل بینائی دل
ایسا اک خواب بھی ہے

○

کہاں سے اُڑ کے آیا پنچھی
کہاں ہے اس کا دیس
نیل گگن میں اُڑنے والا دور دور سے آیا
کس نے اس پاپی نگری میں پنجرے میں بٹھلایا
اک سندر سپنے میں اُس نے دیکھی جگ کی مایا
سارا جیون بہتے پانی پہ چندا کی چھایا
ایسے سمے میں کھو کر مورکھ بھولا اپنا پرایا
کبھی کبھی آکاش سے اس کو کوئی سندیسہ لایا
کبھی کبھی چندا سے اُس نے دور سے نیہہ لگایا
لیکن چاروں اور سلاخیں جب اُڑنے پر آیا
کس نے اُس کی بپتا دیکھی اور پنجرے کو ڈھایا
بن پنکھ لگا اُڑنے پھر پنچھی
گیا بدل کر بھیس

○

اتنی فرصت ہو مجھے
بادلوں میں چاند کو دیکھا کروں
موجۂ آبِ رواں پہ لالہ و گل کے ٹہلتے
عکس کا پیچھا کروں
خلوتِ شامِ خزاں میں بیٹھ کر سوچا کروں
جستجوئے آب و دانہ میں ہوں میں شام و سحر
زندگی پھر بھی مرے تخئیل میں
ہے پرِ پرواز و منقارِ ترنّم آشنا

○

ابرِ برق آشام آیا جھومتا
آسمانِ نیلگوں میں گھومتا
ماہ و انجم وسعتوں میں چھپ گئے
عشقِ مے آلود آیا جھومتا
کاروانِ رنگ و بو سے گھومتا
علم و حکمت نکہتوں میں چھپ گئے

○

نین کنول مرجھائے

ساجن لوٹ نہ آئے

آشا کی اگنی تو من میں دیپ پہ دیپ جلائے
سمئے پرانا پاپی جگ میں لاکھوں چاند بجھائے
ڈگر ڈگر بھٹکائے

ساجن لوٹ نہ آئے

کیا جانیں میری نینوں سے نندیا کون چرائے
کاش مجھے آکاش پہ ایسا اک تارا مل جائے
جو چاند کا دیس دکھلائے

ساجن لوٹ نہ آئے

بیتی رتیاں! آج جو مجھکو میرا کل مل جائے
میں جیون کی ناؤ ڈبو دوں جو وہ مانجھی آئے
کون اسے سمجھائے

ساجن لوٹ نہ آئے

گیت

من میں میگھ ملہار کوی کی آنکھوں میں برسات
سارے جیون پر پھیلانا
اک سپنے کا تانا بانا
اسی لگن میں مگن مگن، سا رہتا ہے دن رات
ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرنا
اور تاروں سے باتیں کرنا
جانے کب تک جگ پہ رہیگی کالی کالی رات
بیٹھا ہے یہ آس لگائے
کب پھولوں کی دلہن آئے
کب اس پھلواڑی سے نکلے بھونروں کی بارات

حمید عظیم آبادی

نام :- سید عبدالحمید تخلص :- حمید وطن :- عظیم آباد (پٹنہ)

سالِ ولادت :- سنہ ۱۸۹۷ء - ہجرت :- فروری سنہ ۱۹۵۶ء

موجودہ پتہ :- جناح چوک سکھر

مشاغل

مطالعۂ کتب، درس و تدریس، شعر و شاعری اور تصنیف و تالیف۔
رکنِ عاملہ مجلسِ ادب سکھر۔ مدیر سہ ماہی "جامِ جم" سکھر۔ رکن ادارۂ مصنفین پاکستان

تصانیف و تالیفات

(۱) فکرِ بلیغ (سنہ ۱۹۲۸ء) (۲) رمز العروض (سنہ ۱۹۳۶ء) (۳) شادؔ کے سو نشتر (سنہ ۱۹۳۷ء) (۴) میخانۂ الہام (دیوانِ شاد) (سنہ ۱۹۳۸ء) (۵) جامع العروض (سنہ ۱۹۳۹ء) (۶) رباعیاتِ شادؔ مع منظوم انگریزی ترجمہ (۷) راسخ (سنہ ۱۹۵۰ء) (۸) مراثیِ شادؔ جلد اوّل (سنہ ۱۹۵۲ء) (۹) مفتاح العروض سنہ ۱۹۵۲ء) (۱۰) کلامِ بیتاب (سنہ ۱۹۵۲ء) (۱۱) مراثیِ شادؔ جلد دوم (سنہ ۱۹۵۴ء) (۱۲) سرودِ مستی قطعاتِ شادؔ (سنہ ۱۹۵۶ء) (۱۳) فروغِ ہستی (مسدس وغیرہ کا مجموعہ سنہ ۱۹۵۸ء) (۱۴) میخانۂ الہام (اشاعتِ دوم سنہ ۱۹۶۲ء)

نعتیہ قصیدہ

(صلِّ علیٰ محمّدٍ)

سلامت میکدہ ساقی دمِ راز و نیاز آیا
پلا دے جامِ مدہوشی، مَیں ہشیاری سے باز آیا

وہ بیہوشی کہ جس پر عقل کو قربان کرتے ہیں
وہ مستی جسکے صدقے میں ہمیں ذوقِ نیاز آیا

وہ کیفِ روح پرور، مایۂ ہوش و خردمندی
کہ جس سے تیرے مستوں کی سمجھ میں تیرا راز آیا

یہی وہ مے پرستی ہے کہ جس پر اتقا صدقے
یہی مے ہے جسے پینے کو فتوائے جواز آیا

یہی مے ہے جو دل سے داغِ نخوت کو مٹاتی ہے
یہی مے ہے کہ جس سے سربلندوں کو نیاز آیا

تصدق میری جاں اس بادۂ گلرنگ پر ساقی!
جسے پی کر حق و باطل کا مجکو امتیاز آیا

ملے اک جام پھر بھر کر کہ مٹ جائے خمارِ غم
رہے قائم مری مستی کہ ہنگامِ نیاز آیا

جھکا یہ سر تو ترے آستانے پر جھکا ساقی
مجھے آیا تو بس تیرے ہی در سے ساز باز آیا
اسی در سے نشاں مجکو ملا راہِ حقیقت کا
مجھے جھکنے میں جن قدموں پہ بھی لطفِ نماز آیا
بھلا کیا پوچھنا سرمستیوں کا بادہ نوشوں کی
کہ رسمِ جشنِ میلادی کا دورِ جاں نواز آیا
خوشا یہ ماہِ فیروزی، خوشا یہ جشنِ میلادی
خوشا تقدیر رندوں کی کہ وہ عاجز نواز آیا
وہ آیا جس کے صدقے میں ہوئے کون و مکاں پیدا
وہ آیا جس سے اس عالم کو فوقِ امتیاز آیا
وہ آیا جس نے آتے ہی مٹائی کفر کی ظلمت
وہ مہرِ آسمانِ شوکت و شانِ حجاز آیا
وہ آیا جس نے بندوں کو ملایا اُنکے مالک سے
بنایا جس نے بگڑی کو وہ شاہِ سرفراز آیا
وہ گیسوئے معنبر جس میں تھیں وَاللَّیل کی شانیں
وہ چتون، وہ نگاہیں جن سے اس دل میں گداز آیا
پڑھے صلی علیٰ جو دیکھ لے وہ چہرۂ انور
حقیقت کو تھا جس پر ناز وہ حسنِ مجاز آیا

وہ بازوئے مطہر جن سے تھی اسلام کو قوت
وہ سینہ عشقِ حق کا جو چھپائے دل میں راز آیا
وہ پائے اقدس و عالی جو رکنِ دین و ملت تھے
مجھے صدقے میں جن کے لذت و ذوقِ نیاز آیا
وہ کیا آئے کہ دردِ و غم بنا سامانِ صد راحت
وہ ذاتِ پاک کیا آئی، ہمارا دل نواز آیا
صلوٰۃ لاتعد اس ذات پر اس روحِ اقدس پر
کہ جس کے فیض سے دنیائے سرکش کو نیاز آیا
تموج خیز طوفاں ہے، خبر لو یا رسول اللہ
تباہی کے کنارے ہم غریبوں کا جہاز آیا
تری مجلس میں تیرا بندۂ عاجز، تیرا شیدا
سلام شوق کا ہدیہ لئے با صد نیاز آیا
حضوری کا شرف فیضِ کرم سے کر عطا اس کو
یہی حسرت لئے دل میں بہ صد ذوقِ نیاز آیا
گلِ امید سے بھر دے حمیدِ خستہ کا دامن
لگا کر آس تیرے در پہ یا شاہِ حجاز آیا

فارسی کی رباعیاں

یارب کرمے گناہگارم رحمے
از کردۂ خویش شرمسارم رحمے
لطفے لطفے بریں سیہ رو لطفے
رحمے رحمے بہ حالِ زارم رحمے

○

یارب از تو یقینِ رحمت دارم
وز لطفِ تو امیدِ عنایت دارم
بایست کنم شکرِ تو اے بندہ نواز
کز عشقِ تو صد ہزار نعمت دارم

○

اے عشق سرورِ زندگانی از تست
دردِ ہر حلاوتِ جوانی از تست
دل مردہ نگشت آنکہ شد بندۂ تو
از تست حیاتِ جاودانی از تست

○

دارم زغمِ فراقت ایں چہرۂ زرد
رنجور شدم زغصہ و محنت و درد
خاموشیم از ضعف نہ از صبر بود
ورنہ من و ایں نالہ و آہ و دمِ سرد

○

اُردو کی رُباعیاں

اے دشمنِ دیں سیاہ کاری کب تک
کمبخت تری گناہگاری کب تک
ہو کر بھی مسلماں نہ خدا سے ڈرنا
اے تیرہ دروں سیاہکاری کب تک

○

اعجازِ مئے ناب دکھا دے ساقی!
ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو ملا دے ساقی!
لغزش کا مری نہ دھیان کر جام کو دیکھ
بگڑی ہوئی پھر بات بنا دے ساقی!

○

بے ہوشوں کو ہشیار بنا دے ساقی
غفلت کا جو پردہ ہے اٹھا دے ساقی
ہر قطرۂ مے دے ہمیں پیغامِ عمل
سوئی ہوئی قسمت کو جگا دے ساقی!

○

کیا جھوم کے اُٹھی ہیں گھٹائیں ساقی
لبریز ہیں مستی سے ہوائیں ساقی
وہ جام پلا عقل کی آنکھیں کھل جائیں
تقویٰ بھی لے مستی کی بلائیں ساقی

○

اک نور کا دریا ہے کہ لہرانے لگا
کوثر کی بہاریں مجھے دکھلانے لگا
اللہ رے ضو پاشیِ روئے ساقی
ساغر میں مجھے چاند نظر آنے لگا

○

قطعاتِ اردو

عشق کو راہبرِ منزلِ الفت سمجھو
شرطِ ایماں ہے کہ تم رازِ حقیقت سمجھو
عیدِ قرباں ہی کہ ہے جلوۂ ایثار حمیدؔ
سر کٹانے ہی کو معراجِ محبت سمجھو

آؤ پھر تذکرۂ صحبتِ رندانہ کریں
آؤ پھر بیٹھ کے ذکرِ مے و میخانہ کریں
ہر نفس بادۂ سرجوش سے اٹھیں شعلے
آؤ تجدیدِ ضیا پاشیِ پیمانہ کریں
آئے کانوں میں وہی قلقلِ مینا کی صدا
پھر اسی جوش سے ہم نعرۂ مستانہ کریں
قصۂ کہنہ میں کچھ جدتِ ترمیم بھی ہو
اس طرح یاد وہ بھولا ہوا افسانہ کریں
خوبیِ نظم بھی ہو، جدتِ تخئیل بھی ہو
شوخ کچھ اور ذرا رنگِ قدیمانہ کریں
اگلی صحبت کا سماں آنکھوں میں پھر جائے حمیدؔ
آؤ پھر تذکرۂ بادہ و پیمانہ کریں

ایک روز جو پہنچا میں خمستانِ سخن میں
قصہ کسی میکش کا تھا افسانہ کسی کا
تھے لب پہ کسی مست کے اشعار کسی کے
پڑھتا تھا کوئی مطلعِ رندانہ کسی کا
کہتا تھا کوئی ختم ہوئی مستیِ سخن اب
اگلی سی نہ مے ہے، نہ وہ پیمانہ کسی کا
یہ سن کے مرا دل ہوا مایوسِ تمنا
جیسے کہ ہو اُجڑا ہوا کاشانہ کسی کا
ساقی نے جو دیکھی مری حسرت زدہ صورت
سمجھا کہ ہے یہ بھی کوئی دیوانہ کسی کا
بولا کہ نہ گھبرا، یہ ہے میخانۂ رحمت
خالی نہیں رہتا یہاں پیمانہ کسی کا

بخشش ہی مری عام، سدا دور ہی جاری — مئے خاص کسی کی ہی، نہ میخانہ کسی کا
ہی ذوقِ طلب حاملِ سرمستی و رندی — ساغر نہ کسی کا ہی نہ پیمانہ کسی کا
یہ سنتے ہی قدموں پہ حمید اُس کے گرا میں — اللہ رے الطافِ کریمانہ کسی کا

فضائیں ہیں لئے سامانِ مستی اپنے دامن میں — اُٹھا پھر جھومتا بادل، چلے پھر دورِ ساغر کا
چلے ساغر بڑھے مستی، بڑھے مستی چلیں ساغر — دکھائے میرا ساغر مجھکو نقشا جامِ کوثر کا
یہ وہ ساغر ہے جسکو دستگیرِ میکشاں کہئے — یہ وہ لغزش ہی کرتی ہی جو ہردم کام رہبر کا
نہ ہے ایسی لغزش پیہم، خوشا ایسی مستی و رندی — نظر آئے مرے ساغر میں جلوہ آبِ کوثر کا
مرے ساقی! خدا رکھے ترے دامن کی وسعت کو — کہ منت کش نہیں اب تک ہوا میں دیدۂ تر کا

ای زہے مستیِ فطرت باغ میخانہ بنا — گل سبوئے مے بنے، نرگس کا پیمانہ بنا
مست ہو ہو کر وہ کالے بادلوں کا جھومنا — پھر رہا ہو جیسے پی کر کوئی مستانہ بنا
پھول کھلتے ہیں کہ فطرت جوش میں ہے خندہ زن — بادۂ عشرت سے ہے ہر نخلِ مستانہ بنا
فصلِ گل ہی یا کہ فطرت لیتی ہے انگڑائیاں — جو شجر ہی جوشِ مستی میں ہی دیوانہ بنا
حسنِ فطرت کھینچتا ہی دل کو ہر انسان کے — اپنی کم نظری سے پھرتا ہے یہ بیگانہ بنا
اب تو جچتا ہی نہیں نظروں میں حسنِ دلنواز — مجھکو تو ای حسنِ فطرت! اب سے بیگانہ بنا!
دل کو اب بھاتی نہیں سرگشتگیِ کوئے ناز — توڑ دے وہ سلسلہ اور مجھکو فرزانہ بنا
ہوں بہرورِ محض سے عشرت نوازِ زندگی — کیا کہوں کیا کیف آگئیں، گل کا پیمانہ بنا
مجھکو زنجیریں پنہا ای موجۂ بادِ بہار — مجھکو ای لیلیِ فطرت! اپنا دیوانہ بنا

نظم

شباب

بس اک کروٹ میں فطرت کی چلن بدلا، ادا بدلی
نظر کی کیفیت بدلی، سخن بدلا، حیا بدلی
وہ اندازِ ستم بدلا، وہ طرزِ دلربا بدلی
نظر آتی ہے گویا ساری دنیا کی فضا بدلی

زمانہ یک بیک بدلا، دلوں میں پیچ و تاب آیا
شباب آیا کہ دُنیائے سکوں میں اضطراب آیا

کسی نے آکے چھیڑا ایک بیکس دل کی تمنا کو
کسی نے کر دیا آباد گویا دشت و صحرا کو
تموج زا کسی نے کر دیا خاموش دریا کو
کسی نے خواب سے جیسے جگایا سوئی دنیا کو

اُٹھی انگڑائیاں لیتی ہوئی دیوی محبت کی
نئی بستی لگی بسنے امید و شوق و الفت کی

بدل جاتا ہے اندازِ تخاطب بھی تکلم بھی
تغیر زا نظر آتا ہے لہجے کا ترنم بھی
فزوں ہوتا ہے ذوقِ نکتہ سنجی و تفہم بھی
جھجک کے ساتھ بڑھ جاتا ہے احساسِ توہم بھی

تلاطم سا بپا ہوتا ہے دریائے تمنا میں
نئی اک جان آجاتی ہے گویا دل کی دنیا میں

تنفس کا تموج بھی بدل دیتا ہے رُخ اپنا — اُمڈ آتا ہے ارماں کے تلاطم کا نیا دریا
نظر آتا ہے انساں کو نیا عالم، نیا نقشا — خدا کی شان پل بھر میں بدل جاتی ہے کل دنیا

حیا، شوخی کے پردے میں قضا کا کام کرتی ہے
جفا و جور کی دیوی نہا دھو کر نکھرتی ہے

جبیں پر دوڑنے لگتی ہیں موجیں جامِ عشرت کی — رُخِ گلگوں دکھاتا ہے بہاریں صبحِ جنت کی
خمِ گیسو میں پڑ جاتی ہیں گرہیں دامِ الفت کی — بھنویں تن کر کمانیں کھینچ لیتی ہیں محبت کی

پلک اُٹھ کر لگاتی ہے نگاہِ ناز کی برچھی
نظر جھک کر گراتی ہے دلِ بیتاب پر بجلی

سراپا حُسن ہو جاتی ہے انساں کی نظر گویا — نظر آتا ہے ہر شے میں کرشمہ حسنِ صنعت کا
نمو کے موجزن ہوتے ہیں رگ رگ میں کئی دریا — اُبھر پڑتے ہیں دم بھر میں نقوشِ حسنِ بے پروا

جدھر اُٹھتی ہیں آنکھیں حُسن کا گلزار ہوتا ہے
جوابِ گُل نگاہِ شوق میں ہر خار ہوتا ہے

کبھی رفتار میں لغزش، کبھی ہے چال مستانہ — جنوں کے کیف میں چلتا ہو جیسے کوئی دیوانہ
کبھی لب پر محبت کا سرور آمیز افسانہ — کبھی انداز ترکانہ، کبھی نظروں میں میخانہ

یہ وہ مستی کا عالم ہے کہ عقل و ہوش کی دنیا
ڈبو دے زاہدِ خلوت نشیں بھی ہو کے بے پروا

عجب سرمست عالم ہوتا ہے عہدِ جوانی کا — اُترتا ہی نہیں جامِ مئے پُرکیف کا نشہ
خرد سے کام رہتا ہی نہیں اس دور میں اصلا — سروں میں ہر گھڑی رہتا ہے نازِ حسن کا سودا

خوشی سے نازوالوں کے جفا و جور سہتے ہیں
نظر کے تیر بھی دل میں تمنا بن کے رہتے ہیں

حمید اک خواب ہے بھولا ہوا وہ دورِ کیف افزا — نہ وہ سر ہے، نہ وہ سودا، نہ وہ قصے، نہ وہ چرچا
ضعیفی نے بدل ڈالا مری تصویر کا نقشا — مآلِ کار کا دل کو لگا ہے ہر گھڑی دھڑکا

خوشا وہ عقل کو رہبر بنائے جو جوانی میں،
نہ لغزش ہو قدم کو جس کے عیش و کامرانی میں

○

تابشِ برقِ تمنّا میں کمی ہوتی نہیں
دیکھ کر جلووں کو بھی آسودگی ہوتی نہیں
اے خوشا سجدے کہ معراجِ خودی حاصل ہوئی
تیرے بندوں سے کسی کی بندگی ہوتی نہیں
ضبطِ غم بھی شرطِ آدابِ محبت بن گیا
داغِ دل جلتے ہیں لیکن روشنی ہوتی نہیں
لَو بڑھائیں جس قدر بڑھتی ہے اتنی روشنی
شدتِ غم سے محبت میں کمی ہوتی نہیں
ہر نفس جب تک نہ بن جائے فروغِ آرزو
سانس چلتی ہے مگر وہ زندگی ہوتی نہیں
یہ تو اک ناسور ہے تا عمر جو رستا رہے
دل بجھانے کو شاید دوستی ہوتی نہیں
داغہائے سوزِ الفت کو خدا رکھے حمیدؔ
جس جگہ جلتی ہیں شمعیں، تیرگی ہوتی نہیں

○

غم جو تھا شورشِ بداماں ساری محفل کے لئے
بن گیا سامانِ تسکیں وہ مرے دل کے لئے

کلکِ قدرت نے ازل ہی میں دیا رنگِ دوام
دل بنا غم کے لئے اور غم بنا دل کے لئے

خندۂ گل میں نہاں ہے اشکِ شبنمِ کائنات
تازیانہ ہے اسیرِ رنگِ محفل کے لئے

اضطرابِ شوق میں پنہاں ہے احساسِ حیات
کیوں ہیں موجیں اسقدر بیتاب ساحل کے لئے؟

عقل سودا بن کے چاہے جس کے بھی سر میں رہے
عشق تو پیدا ہوا دانش گہہِ دل کے لئے

منزلیں خود چومتی ہیں اُسکے مجنوں کے قدم
اور دنیا ہے کہ سرگرداں ہے منزل کے لئے

ایک نقشِ دائمی بن کر رہا رنگِ جنوں
دردِ سر بن کر رہی وحشت سلاسل کے لئے

جلوۂ رنگیں تو پردہ ہے حجابِ ناز کا
لوگ کیوں مجنوں بنے پھرتے ہیں محمل کے لئے

سانس بھی خارِ خلش زا بن کے چبھتی ہے حمیدؔ
اک بلائے جان محبت ہو گئی دل کے لئے

ملتے ہیں یہاں ہر دم پیمانے پہ پیمانے
ساقی کی نگاہوں پر قربان ہیں میخانے

تاریکیٔ محفل کو کس طرح مٹاتے ہیں
جل جل کے سبق ہم کو دیتے رہے پروانے

ارماں کو کبھی سجدے، خواہش کی کبھی پوجا
ہم نے تو بنا رکھے ہر گام پہ بتخانے

آنکھوں نے نظر بدلی، رخ سانس نے بھی پھیرا
اک وقت وہ آتا ہے، اپنے بھی ہیں بیگانے

دنیا کی بہاریں خود زنجیرِ بداماں ہیں
دیوانے تو دیوانے، مجنوں بنے فرزانے

خود اپنے گریباں کی دھجی وہ اڑاتا ہے
دیوانہ ہے جو جائے دیوانے کو سمجھانے

دل ساغرِ حسرت زا اور جامِ الم آنکھیں
کم ظرفِ بہاراں سے ناپو نہ یہ پیمانے

آئنہ ہے جب ان پر ہر پیچ و خمِ عالم
رُخ سب سے نہ کیوں پھیریں ان زلفوں کے دیوانے

آئے گی اجل جس دم، پھر کون حمیدؔ اپنا
اتنا بھی نہ تم سمجھے! دیوانے ہو دیوانے

مستِ مئے طرب تھا سراپا سرور تھا
جب تک کہ دل ہجومِ تمنا سے دور تھا

تھا زینتوں سے کام ، نہ شوقِ ظہور تھا
کیا دن تھے وہ کہ یار سراپا غرور تھا

چھانی جو خاکِ دشتِ محبت کی تب کھُلا
صحرائے دل ہی وادیِ ایمن تھا طور تھا

لو کے لگائے خرمنِ صبر و قرار میں
اک برقِ بے قرار دلِ ناصبور تھا

تڑپا نہ وقتِ ذبح تو حیرت کی جا ہے کیا
بسمل قریبِ دامنِ قاتل ضرور تھا

روزِ الست پی تھی جو ساقی کے ہاتھ سے
اب تک اُسی کا بادہ کشوں کو سرور تھا

جبتک رہا یہ سینے میں لینے دیا نہ چین
پہلو میں اک عذابِ دلِ ناصبور تھا

مخفی تھی میری ذات میں اُس کی نمود بھی
میرا ظہور عین اُسی کا ظہور تھا

کیا ہے کہ آج لب پہ فغاں آگئی حمیدؔ
سنتے تھے سب سے ہم کہ تو مردِ غیور تھا

تسلّیوں کو نظر کی جمالِ یار تو ہے
ہزار پردے ہوں آئینہ بہار تو ہے

نہاں خزاں میں ہماری تری بہار تو ہے
قرار چھیننے والے تجھے قرار تو ہے

ہزار جلوے چمکتے ہوں برق کی صورت
چراغِ طور لیے سوزِ انتظار تو ہے

خوشی کے پھول کھلیں یا جگر کے داغ جلیں
نظر نواز مگر جلوۂ بہار تو ہے

فروغِ گُل کا یہ دامِ فریب اے توبہ!
مری نگاہ کو اندازۂ بہار تو ہے

ہجومِ یاس تری دلدہی کے ہیں قرباں
فریب خوردۂ ارماں کو اب قرار تو ہے

حمید یہ بھی کرم ہے نگاہِ ساقی کا
کہ اُس کے بادہ کشوں میں ترا شمار تو ہے

○

خلش ہے، درد ہے یا اضطرار ہے کیا ہے؟
ہمارے پہلو میں دل ہے کہ خار ہے کیا ہے؟

وفورِ شوق جدا، دردِ اضطرار جدا
بلا ہے یا کہ شبِ انتظار ہے، کیا ہے؟

ہے ملنا شرط کہ بسمل بنا دیا دل کو
نگاہِ ناز کہ خنجر کی دھار ہے کیا ہے؟

نشاں نہیں ہے یہ اک آئنہ ہے عبرت کا
فنا کا درس کہ لوحِ مزار ہے، کیا ہے؟

اِدھر ہیں چاک گریباں اُدھر سبو بر کف
گلوں کو غم کہ سرورِ بہار ہے، کیا ہے؟

ابھی تو دل ہے شگفتہ، ابھی ہے پژمردہ
یہ کیا خزاں ہے یہ کیسی بہار ہے، کیا ہے؟

نظر ملی کہ پلا دی کسی نے جیسے شراب
نگاہِ یار میں کیفِ خمار ہے، کیا ہے؟

مٹا تو مٹنے کو لیکن ہوں ہر جگہ موجود
محیطِ کُل ہے کہ میرا غبار ہے، کیا ہے؟

ہمیشہ سینے میں اِک آگ سی لگی ہے حمید
شرار ہیں کہ دلِ داغدار ہے، کیا ہے؟

نمودِ شوق، صیدِ خستہ تن کی آزمائش ہے
مرے ذوقِ تماشائے چمن کی آزمائش ہے

بھری محفل میں ذوقِ خود نمائی کھینچ ہی لایا
نگاہِ شوقِ اہلِ انجمن کی آزمائش ہے

رگِ گردن چلی آتی ہے ابھری "اے زہے ہمت"
کشاکش میں ہے جاں، دار و رسن کی آزمائش ہے

کدورت ننگِ ساغر ہے، خلش میں رنگِ ناکامی
وفا کی جانچ، اہلِ انجمن کی آزمائش ہے

وہ ہنس ہنس کر نمک پاشِ جراحت ہوتے جاتے ہیں
بہارِ خندۂ زخمِ کہن کی آزمائش ہے

دلِ بیتاب! برقِ طور سے مجکو نہ ہنسوانا
قفس میں میری آہِ شعلہ زن کی آزمائش ہے

حمیدؔ ایسا نہ ہو کانٹوں کی خو پھولوں میں آجائے
بہار آئی ہے گلہائے چمن کی آزمائش ہے

نہ آج تک کوئی اِس رنگ سے چراغ جلا
دلِ تپیدہ میں جسطرح غم کا داغ جلا

فقط نہ وادیٔ ایمن کے دل کا داغ جلا
شعاعِ حسن سے ذرّوں کا بھی چراغ جلا

یہ راہِ عشق ہے مٹنا ہی اس کی منزل ہے
نفس کے سوز سے ہر رشتۂ سراغ، جلا

خوشا فتیلۂ الفت کی گلِ نوازِ ضیا
زمانہ ہو گیا پُر نور، وہ چراغ جلا

یہاں تو شعلہ حرماں ہے اور کنجِ قفس
کسے خبر ہے نشیمن جلا کہ باغ جلا

جگر کے داغ یونہی حشر میں بھی چمکیں گے
جلا جو سوزِ محبت سے وہ چراغ جلا

کسی کے دستِ نگاریں ہیں وہ مئے سر جوش
نگاہیں کانپ رہی ہیں کہ کیا ایاغ جلا؟

ہزاروں داغ ہیں کس کس کو دھوئے گی شبنم
بتاؤں کیا میں گلو! کیسا کیسا داغ جلا

(ق)

قفس نصیبوں پہ اتنا نہ کر ستم صیّاد
خدا کو مان نہ یوں ظلم کا چراغ جلا

یہ شعلہ ہائے ستم خود بخود بھڑکتے ہیں
تو سوچتا ہی رہے گا کہ کیسے باغ جلا

ملا نہ خاک بھی اِن کاوشوں کا اجر حمید
جگر جلا، دلِ مضطر جلا، دماغ جلا

○

اشکوں میں جو طوفانِ شرر ڈھونڈھ رہا ہوں
میں دل کو بہ اندازِ دگر ڈھونڈھ رہا ہوں

بے تاب ہو کیوں لینے دو اشکوں کا سہارا
نالو! ابھی اسبابِ اثر ڈھونڈھ رہا ہوں

جو برقِ سرِ طور کو دامن میں جگہ دے
مدّت سے وہ بیتاب نظر ڈھونڈھ رہا ہوں

کیوں اتنے حجابات ہیں؟ کیوں اتنا تکلّف؟
مَیں جلوۂ مانوسِ نظر ڈھونڈھ رہا ہوں

ہر داغِ الم زینتِ گلزارِ طرب ہو
گلکاریِ دامانِ سحر ڈھونڈھ رہا ہوں

اے داغِ محبت تو ہی ضو اپنی بڑھا دے
اک شمعِ سرِ راہگذر ڈھونڈھ رہا ہوں

اللہ رے حمیدؔ اپنی یہ معصوم نگاہی،
کانٹوں میں بھی رنگِ گُلِ تر ڈھونڈھ رہا ہوں

نہ ہے جامِ الفتِ غم فزا کہ تڑپ میں کیف قرار ہے
رہیں داغِ دل کی یہ سوزشیں کہ خزاں میں رنگِ بہار ہے

جو مٹوں تو نقش فنا مٹے، یہ دوئی کا داغ نہ پھر رہے
میں وہ گُل ہوں گلشنِ دہر میں کہ خزاں ہی میری بہار ہے

دلِ مبتلا کا تو ذکر کیا دلِ شادماں ہی سے پوچھئے
کسے دارِ غم میں سکوں ملا، کسے زندگی میں قرار ہے

نہ جگر کے داغ مٹا سکے، نہ خلش کو دل کی گھٹا سکے
نہ جو قیدِ غم سے چھڑا سکے، وہ بہار کوئی بہار ہے

وہ جو گذرے میرے مزار سے تو نقاب چہرے پہ ڈال لی
یہ ادا ہی کہتی ہے برملا کہ ابھی بھی دل میں غبار ہے

وہ بُری بلا ہے یہ دردِ دل، نہ دوا سنے نہ دعا سنے
نہ تڑپ میں چین کی صورتیں، نہ سکوں میں رنگِ قرار ہے

جو رہے تو مرکزِ این و آں، جو مٹے تو مٹ کے ہو اصلِ کُل
ہے محیطِ کُل کا جو آئینہ، یہی ایک مشتِ غبار ہے

کبھی دل کھلا ہوا پھول ہے، کبھی جیسے سوکھی کلی کوئی
ابھی ہنس پڑے ابھی رو دیئے، یہی زندگی کی بہار ہے

مری چشمِ تر کو نہ دیکھئے، مرے دردِ دل کو نہ پوچھئے
مرا دل نہیں ہے حمید یہ، مری حسرتوں کا مزار ہے

○

ضبطِ غم پر گریۂ بے اختیار آہی گیا
جب کوئی مینکش ملا ذکرِ بہار آہی گیا
روح مضطر، دل پریشاں، آرزوئیں مضطرب
وہ چلے اور لمحۂ صد انتشار آہی گیا
اُن کی بدعہدی فروغِ غمزۂ رنگیں بنی
کیسی ناداں ہے محبت، اعتبار آہی گیا
لغزشیں بھی اک سہارا مغفرت کا بن گئیں
گرتے گرتے ہاتھ میں دامانِ یار آہی گیا
دیکھیے موجِ نگاہِ نازِ جاناں کا اثر
میری پیشانی پہ عکسِ اضطرار آہی گیا
ہو چلے توبہ سے تھے مانوس کچھ کچھ بادہ خوار
چٹکیاں لینے کو پھر ابرِ بہار آہی گیا
عمر بھر کی پردہ داری ہو گئی نذرِ اجل
میرے لب پر نام اُن کا بار بار آہی گیا
اُٹھ رہا ہے رُخ سے پردہ اب حجابِ ناز کا
موت کے ہاتھوں پیامِ خوشگوار آہی گیا
کیا کہوں رنگینیاں مشقِ تصور کی حمید
میں یہ سمجھا جیسے وہ جانِ بہار آہی گیا

شاهزاده ایاز

پیدائش ــــــــ ۱۹۰۸ء

پیشہ ــــــــ صحافی

تصانیف

ناول افسانے وغیرہ	{	نئی کروٹ ۔ برہنہ شرم ۔ کولہو کے بیل ۔ چھوٹا منہ بڑی بات ۔ برجِ خاموش ۔ انوکھی محبت
درسی کتب	{	اصولِ شہریت ۔ شاہین اردو ریڈر اوّل، دوم، سوم، چہارم اخلاقیات ۔ اوّل، دوم، سوم ۔ مختصر تاریخ اسلام ۔ مختصر تاریخ سندھ

مستقل پتہ

منزل گاہ روڈ ۔ سکھر

زرد تنکے

صبح رینگتے ہوئے شب کے بستر سے نکلی اور میں انگڑائی لیتا ہوا اٹھا۔ ملازم چائے لئے کھڑا تھا۔ میں نے چائے پینا شروع کی اور وہ چلا گیا۔

میں چائے پی رہا تھا اور رات کے خواب کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اگر یہ خواب سچا ہے تو میری خوش قسمتی کی کوئی انتہا نہیں ہوگی اور اگر یہ خواب جھوٹا ہے جیسے کہ اکثر خواب جھوٹے ہوا کرتے ہیں تو میں سوائے اسکے کیا کر سکتا ہوں کہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو جاؤں۔

جب کبھی میں ان خوابوں کا تذکرہ منور ما سے کرتا ہوں تو وہ کہتی ہے کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس جائیے، آپ کا معدہ خراب ہے۔ میں اپنے خوابوں کی یہ تعبیر سن کر نہ جانے کیسے ہنستا ہوں کہ وہ کہتی ہے۔ آپ اپنی خفت مٹا رہے ہیں اور سچ پوچھئے تو آپ ہنس نہیں رہے ہیں بلکہ رو رہے ہیں بالکل ایسے کہ جب بہار اپنا دامن سمیٹتی ہے اور خزاں دبے پاؤں چمن میں داخل ہوتی ہے تو چمن کے پودے اور درخت روتے ہیں۔ کوئی ان کا رونا نہیں دیکھ سکتا اور سب یہ سمجھ کر مسکرا دیتے ہیں کہ وہ ہنس رہے ہیں۔ کسی کے پاس آنکھ ہی نہیں کہ ان کے زخمی تبسم کو دیکھ سکے۔

منور ما میرے سینیٹوریم میں نرس ہے۔ اُسے مجھ سے خاص لگاؤ ہے۔ یہ لگاؤ اتنا ہی مقدس ہے جتنا کہ میرا پیشہ۔ ڈاکٹر کی نظر پاکیزہ اور مقدس ہونی چاہیئے۔ اور جس ڈاکٹر کی نظر میلی ہو اُسے اِس مقدس پیشہ کی حدود سے دھکے مار کر نکال دینا چاہیئے جیسے ایک بد کردار پادری کو گرجا سے دھکے مار کر ایک لڑکی نے نکالا تھا اور پھر وہ کبھی لوٹ کر گرجا میں نہیں آیا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اب کسی اور گرجا میں اپنے تقدس کی چادر بچھائے

بیٹھا ہو۔ منورما وہی لڑکی ہے جس نے پادری کو سیڑھیوں سے گرایا تھا جسے اب گرجا کے نام سے نفرت ہے۔ جو مذہب کو ایسا کمزور آشیانہ سمجھتی ہے جسے کسی چڑیا نے چند زرد تنکے جمع کر کے کہیں آہنی مشین کے بالائی حصہ پر اس لئے بنایا ہو کہ اس مضبوط مشین پر آشیانہ بنانے سے وہ خود، اس کے بچے اور گھونسلہ محفوظ رہیں گے مگر جب وہ بیکار مشین انسانی ضرورت کے پیٹ کا ایندھن بنی تو اُس چڑیا کا گھونسلہ ٹوٹ گیا۔ زرد تنکے ایک ایک کر کے اِدھر اُدھر گرے اور بیچاری چڑیا بے گھر ہو گئی۔

وہ اب مذہب اور عبادت گاہ کے نام سے نفرت کرتی ہے۔ اُسے عبادتگاہ میں جانے والے ہر شخص کا کردار اُس پادری جیسا معلوم ہوتا ہے جسے وہ مقدس باپ سمجھتی تھی اور جس مقدس باپ نے ایک دن اُس کی "جوانی" پر ہاتھ ڈال دیا تھا۔ وہ حظ اور تکلیف کے ملے جلے احساس سے چونکی اور مقدس باپ کے منہ پر تھوک دیا۔ اُسے دھکیلتی ہوئی گرجا کی سیڑھیوں پر لے آئی اور ایسا گرایا کہ وہ پھر اس پہاڑ پر کبھی نہ دیکھا گیا۔ اُسی شام وہ میرے پاس آئی اور کہا۔

ڈاکٹر میں فرسٹ ایڈ جانتی ہوں اگر آپ مجھے ملازم رکھ لیں تو ـــــ

تمہارا نام

منورما

اچھا تم ہی منورما ہو جو اس پہاڑی علاقہ کی ہر ان پڑھ لڑکی کو پڑھانے کا مشن لیکر اُٹھی ہو۔

جی۔

میرے ہاں ملازمت کے بعد تمہیں اتنا وقت نہیں ملے گا کہ تم اس نیک مشن کو پورا کرسکو۔

میں ڈیوٹی کے اوقات میں یہ کام نہیں کروں گی۔

منورما کو میرے ہاں کام کرتے ہوئے دو سال ہو چکے ہیں۔ وہ اس قدر دلچسپ ہے کہ میں نے اُسے نرسنگ کا کام سکھانے میں تساہل سے کام نہیں لیا۔ میں اسکی باتیں دلچسپی سے سنتا ہوں۔ وہ انتہائی بے تکلفی سے میرے ساتھ وہ تمام باتیں کرتی ہے جو اُسے نہ کرنی چاہئیں۔ وہ بھولے پن سے سب کچھ کہہ جاتی ہے اور میں سنجیدگی سے اُس کی باتیں سنتا ہوں۔ وہ مجھے سینیٹوریم کے بہت سے مریضوں کے حالات سناتی ہے اور میں یہ سن کر حیران ہوتا ہوں کہ میرے سینیٹوریم کے نوے فیصد مریض محبت کے باعث دق میں مبتلا ہیں۔

میں سوچتا ہوں کہ محبت اتنی بیمار کیوں ہے۔ محبت کو توانا اور تندرست ہونا چاہیئے تھا۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد میرا دل خود بخود جواب دیتا ہے، توانا اور تندرست محبت کو بیمار کس نے کیا اور یہ بیمار کیوں رہنے لگی ہے؟ اگر اس کا علاج نفسیاتی اعتبار سے کیا جائے تو شاید بیمار محبت تندرست اور توانا ہو جائے۔ لیکن ہمارے سماج میں محبت کا علاج شادی کے سوا اور کچھ نہیں۔ جس محبت کو شادی نصیب نہیں ہوتی وہ بیمار ہو جاتی ہے۔ تنگ و تاریک مکان سے لے کر عالی شان محل تک محبت دق کا شکار نظر آتی ہے۔ تنگ و تاریک مکان کی محبت وہیں سسکیاں لیکر مرجاتی ہے اور عالیشان محل کی محبت سینیٹوریم میں آکر دم توڑتی ہے۔

منورما محبت کو جنسی ہیجان کا ترجمان سمجھتی ہے۔ وہ کہتی ہے محبت صرف وہ لوگ کرتے ہیں جو ذہنی طور پر بیمار ہوتے ہیں۔ وہ شادی کو ایک قسم کا سماجی رواج سمجھتی ہے جس کے بغیر بھی زندگی گذر سکتی ہے۔ وہ جب کبھی فرصت میں مریضوں کی محبّت کے قصّے سناتی ہے تو کہتی ہے کہ یہ لوگ جھوٹی کہانیاں گھڑ کر اپنی روح کو تسکین دیتے ہیں۔ محبت انسان کو اپنے آپ سے کرنی چاہیئے۔ جنسی محبت کی ناکامی کو محبت کا نام دے کر اپنے آپ کو مدقوق بنا لینا کہاں کی عقلمندی ہے۔

میں اس کی باتیں روزانہ سنتا ہوں اور اس کے فلسفہ پر غور و فکر کرتا ہوں۔

آج میں بہت خوش ہوں لیکن منورما غمگین ہے۔ میں نے اُسے بتا دیا ہے کہ آج جو لڑکی سینیٹوریم میں داخل ہوئی ہے وہی ہے جسے اُس شب میں نے خواب میں دیکھا تھا اور جس کے ملنے کے متعلق کہا تھا کہ اگر مجھے مل جائے تو میری خوش نصیبی ہو گی۔ وہ میری بات سن کر کھلکھلا کر ہنس پڑی اور ہنستے ہنستے اُس کے چہرے کی تمام تر تازگی یکدم غائب ہو گئی۔ اُس کا چہرہ مرجھا سا گیا اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ سکڑتے سکڑتے ایسی شکل اختیار کر گیا ہے جسے انتہائی کرب و اضطراب کا آئینہ دار کہنا چاہیئے۔

میری دلچسپی اس نئی مریضہ کے ساتھ جس رفتار کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی منورما کی شوخیاں اسی شدت کے ساتھ کم ہوتی جا رہی تھیں۔ میں حیران تھا کہ منورما کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ کسی نامعلوم تکلیف کا شکار معلوم ہوتی تھی۔ میں اس کی عبارتِ دل کو پڑھنا چاہتا تھا مگر میرے پاس وہ نظر نہ تھی جو عورت کے دل کو پڑھ سکے۔ میں شب و روز اس لڑکی کو تندرست کرنے میں مصروف تھا۔ اُسے دق تیسرے درجہ پر تھا۔ میں اپنی انتھک محنت سے اچھا کرنا چاہتا تھا مگر ایک نامعلوم شے میرے دل کو کرید رہی تھی اور وہ منورما کی غمگین نگاہوں کی اُداس کہانی تھی۔

ایک روز منورما نے مجھ سے کہا۔

ڈاکٹر سچائی کو چھپانا گناہ ہے یا ثواب۔

میرے نزدیک گناہ اور ثواب کا تخیل حماقت آمیز بزدلی کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ دل جس حقیقت کو خوشی سے قبول کرے اور قبول کرنے کے بعد چھپائے نہیں وہی سچائی ہے، جسے چھپانا یقیناً جرم ہے۔ اسے گناہ کہنا چاہو تو کہہ لو۔

میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔

پوچھو۔

آپ خداوند یسوع پر اعتقاد رکھتے ہیں ؟

میں ابنِ مریم کو ایک پیغمبر اور بزرگ انسان مانتا ہوں۔

ایک عیسائی کا یہ عقیدہ نہیں ہوتا۔

میں عیسائی نہیں ہوں۔

پھر آپ کیا ہیں ؟

تم نے شاید میرے نام سے اندازہ لگایا ہے کہ میں عیسائی ہوں۔ میں نے نام تو اس لئے رکھ چھوڑا ہے کہ لوگ مجھے پہچان سکیں۔ میرا مذہب انسانیت ہے۔ میں مذہب کے نام سے اتنا ہی بیزار ہوں جتنی کہ تم ہو۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تم پادری کی دست درازی کے بعد مذہب سے بیزار ہوئی ہو اور میں تقسیمِ ملک کے مابعد کے واقعات سے متاثر ہو کر مذہب سے دور بھاگنے لگا ہوں۔

وہ کیسے ؟

یہ ایک لمبی داستان ہے جس سے تمہارے افسردہ دل کو اور رنج پہنچیگا۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہیں میری طرف سے کسی قسم کا دکھ پہنچے۔ میں تمہارے خلوص کی قدر کرتا ہوں۔

میرے دکھ اور سکھ سے بے نیاز ہو کر مجھے بتائیے۔

تم مجھے جس نام سے جانتی ہو یہ میرا اصلی نام نہیں ہے۔ مان لو کہ میں پہلے ہندو تھا یا مسلمان، البتہ ان دونوں ناموں میں سے ایک نام میرے مذہب کی بنیاد ضرور تھا۔ میں اپنے مذہب کا سچا نام لیوا تھا اور میرا اعتقاد پختہ تھا۔ میں مذہب کو انسان کی نجات کا وسیلہ سمجھتا تھا لیکن جب میرے ملک کی تقسیم ہوئی اور مذہب کے نام پر آبادی نے تبادلہ کیا تو اس وقت میرے اعتقاد کو زبردست دھکا لگا۔ تم پوچھوگی کیسے ؟

ضرور۔

میں ملک کے بٹنے سے نہ اب رنجیدہ ہوں اور نہ اس وقت تھا لیکن بٹوارے کے وقت جب اپنا اپنا حق سب کو مل گیا تو مذہب کے نام پر اس کے پرستاروں نے ایکدوسرے کو کاٹنا شروع کیا۔ مذہب کے جنون نے سب کو پاگل کر دیا اور نجات کا یہ وسیلہ اپنی پوری بہیمیت کے ساتھ ننگی تلواریں لئے انسانیت کے میدان میں کود پڑا۔ دونوں فرقے اپنی پوری قوت کے ساتھ تلوار چلاتے رہے۔ اس تلوار کے سامنے جو بھی آیا کٹ گیا اس میں میرا کنبہ بھی شامل تھا۔ عورتیں دوسرے فرقے کے لوگ اٹھا کر لے گئے۔ میری بیوی، میری بہن اور بارہ سالہ لڑکی بھی دوسرے فرقہ کی جنسی بھوک کا شکار ہو گئیں۔ میں نہیں جانتا کہ وہ زندہ ہیں یا مر گئیں۔ اگر زندہ ہیں جب بھی وہ مر چکی ہیں اور اگر مر چکی ہیں تو بہت اچھا ہوا۔ یہ لڑکی جسے اُس روز میں نے خواب میں دیکھا تھا اور جو اب میرے سینیٹوریم میں زیرِ علاج ہے، اُسی قافلہ میں تھی جس میں میرا کنبہ آ رہا تھا۔ اس سارے قافلے میں یہی ایک لڑکی پڑھی لکھی تھی اور راستے میں اپنے قافلہ والوں کی خدمت کرتی آ رہی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ غم نے اُسے اس حد تک گھیر لیا ہے کہ یہ سب کچھ بھول گئی ہے۔ مجھے بھی نہیں پہچان سکی جسکے ساتھ مل کر یہ اپنے قافلہ والوں کو ہر منزل پر پانی پلاتی تھی۔ دوائی کھلاتی تھی اور ان کی ڈھارس بندھا کر پھر ایک منزل پیدل چلنے کے لئے تیار کرتی تھی۔

منور یا سن رہی تھی اور اس کے چہرے پر عجیب قسم کا تاثر کبھی اجاگر ہوتا اور کبھی معدوم ہو جاتا لیکن جب اُسے اس لڑکی کے متعلق آگہی ہوئی تو یکایک افسردگی کی گہری پرچھائیں اس کے چہرے سے غائب ہو گئی۔ اس کا پژمردہ چہرہ فوراً گلاب کے پھول کی طرح کھل گیا اور اس نے مسکراتی ہوئی نظروں سے میری جانب ایسے دیکھا جیسے نظروں ہی نظروں میں تشکر کا گلستاں مجھ پر نچھاور کر رہی ہو۔ اُس نے سنبھل کر کہا۔ جانے دیکیئے اس غم آفریں قصے کو۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم ایسے ملک میں

پیدا ہوئے ہیں جہاں مذہب کی انسانیت سے یگانگت نہیں ہے۔

میں خاموش ہو گیا۔ وہ اُٹھی اور مجھ پر اطمینان کی ایک نظر ڈال کر چلی گئی۔ اس کے بعد وہ اپنے معمول کے مطابق کام کرنے لگی۔ اس کا چہرہ اب کسی اندرونی غم کے باعث رنجیدہ نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو بوجھ اُس کے کندھوں پر آن پڑا تھا وہ اب ہٹ گیا ہے اور وہ ہلکی پھلکی ہو کر سینیٹوریم میں چل پھر رہی ہے۔ میں نے اس تبدیلی کو سمجھنے کی کوشش کی اور کئی روز کے غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ منورما کو میری اس دلچسپی سے دکھ پہنچا تھا جو میں نے اس لڑکی کے لیۓ وقف کر دی تھی۔ وہ دلچسپی اب بھی قائم تھی لیکن اب منورما خود بھی اس لڑکی کو اچھا کرنے میں میری مدد کرنے لگی۔

وہ لڑکی اچھی ہوتی گئی۔ اور اب اسکا بیمار ذہن بھی کام کرنے لگا۔ مجھے وہ انتہائی غور سے دیکھا کرتی جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو لیکن میں نے اس معاملہ میں اس کی مدد کرنا مناسب نہ سمجھا۔

ایک روز منورما میرے پاس آئی اور کہنے لگی۔

ڈاکٹر اب تو آپ خوش ہیں۔ چھ ماہ کے اندر ہی آپ کی مریضہ اچھی ہو گئی۔

ہاں اچھی تو ہو گئی (میں نے لاپرواہی سے کہا)

آپ کی دلچسپی نے لاپروائی کا رخ کب سے اختیار کیا ہے؟

میں نہیں چاہتا منورما کہ یہ لڑکی مجھے پہچان لے یا میرے متعلق کوئی بھی یہ جان سکے کہ میں پہلے کون تھا اور اب کون ہوں۔ میں اپنے نام کے ساتھ اس مذہب کا نام چسپاں کرنا نہیں چاہتا جس میں نفرت ہی نفرت تھی۔ جس نے ابنِ آدم کو اس قدر

نفرت کا سبق دیا کہ وہ انسانیت کے خون کا پیاسا بن گیا۔ اُس نے یہ بھی نہ سوچا کہ ......؟

آپ کہتے کہتے رک کیوں گئے؟ اُس نے کہا۔ لیکن آپ کی آنکھوں میں آنسو کیوں؟
کچھ نہیں۔ میں نے آنسو پونچھتے ہوئے اور بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔ منورما! میں نے یہ سینیٹوریم اس لئے کھولا ہے کہ میرے ملک کے مدقوق لوگ تندرست ہو جائیں اور یہ زرد تنکے جنہیں میں جمع کر رہا ہوں انسانیت کے آشیانے میں لگ سکیں۔ میں انسانیت کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ اگر اس خدمت سے انسانیت کو چند توانا عناصر میسر آ سکیں تو میں اسے اپنے مشن کی کامیابی کہوں گا۔ جیسے کہ تم چاہتی ہو عورتیں پڑھی لکھی ہوں اور کم از کم اُن میں اتنا شعور آجائے کہ وہ کسی آڑے وقت اپنی مدافعت آپ کر سکیں۔

منورما مسکرائی اور کہنے لگی۔

ڈاکٹر آیئے ہم ایک سچے دوست کی طرح ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں اور اپنی زندگی اس مشن کے لئے وقف کر دیں۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیا اور اُس نے مسکراتی ہوئی نظروں سے مجھے ایسے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔

انسانیت کی خدمت خدا کی عبادت ہے،
اور خدا کی عبادت مقدس فرض ہے

شناسا گوشے

زندگی میں قہقہے کتنے ہیں اور آنسو کتنے۔ یہی سوچتے اُس نے پچپن ساون گزار دیے اس کی آنکھیں جب کبھی ساون بھادوں کی جھڑی کا ساتھ دیتیں تو وہ بے اختیار چلّا اُٹھتا زندگی میں آنسو ہی آنسو ہیں، غم ہی غم ہیں۔ مگر جب کبھی کسی بہار میں کلیوں کا تبسم اُسے اپنی مسکراہٹوں میں شریک کر لیتا تو وہ اپنی پھولوں بھری جھولی میں مسرتیں ہی مسرتیں دیکھتا۔ وہ ایک بچے کی طرح جلد ہی بہل جاتا اور جلد ہی منہ بسورنے لگتا۔ اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس بھری دنیا میں وہ تنہا ہے یا اس کے چاروں طرف مسکراتے ہوئے بچوں کے چہرے ہی اس کی بھرپور زندگی ہیں۔

قیصر نے بچپن ہی میں اپنی ماں کو ایک آنکھ سے روتے اور ایک آنکھ سے ہنستے دیکھا تھا۔ جبھی سے اُس کے لاشعور میں خوشی اور غم کا تلخ امتزاج رچ گیا تھا۔ اُس نے اپنے باپ کے خاموش احتجاج کا تیکھا پن بھی اپنایا تھا اور اپنی ماں کی چلاتی ہوئی بے بسی کا سوگوار اثر بھی لیا تھا لیکن اُسے ان شناسا گوشوں میں سے کسی نے بھی پناہ نہ دی۔

جوانی کی دھوپ جب ڈھلنے لگی تو اس کا احساس تتلی کے خوبصورت پروں کی طرح نازک ہو گیا۔ اس شدتِ احساس نے اس کے مطالعہ و مشاہدہ کو تیز کر دیا اور وہ تتلی کی طرح صحنِ گلشن میں اِدھر سے اُدھر ہر رنگ و بو سے خلوصِ حیات کا راز معلوم کرنے کے لئے بے چین نظر آنے لگا۔ ایک دن جب اسکی بیوی اپنے پندار کا سہارا لئے اُسکے سر پر ستو جوتے اور حقے کے پانی کی ضرب المثل دہرا رہی تھی تو اُسے یکایک اپنا لڑکپن یاد آ گیا جب اُس کی ماں نے بھی اپنے میاں سے کہا تھا کہ میں تیری کمائی کو اپنی اس ٹوٹی ہوئی جوتی پر بھی نہیں رکھتی۔ اور اس کے باپ نے اپنی سمجھدار اولاد کے سامنے اس توہین کو مصلحتاً گوارا کر لیا تھا۔ یہ کوئی پہلی بار نہ تھی بلکہ جب کبھی روزمرہ کی ضروریات یا دیگر خاندانی امور نے اس کے گھر میں سر اٹھایا تو عورت کے احساسِ کمتری نے

اپنی برتری مزاج کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ اس میں اسکی ماں کا کوئی قصور نہ تھا کیونکہ اسکا باپ اپنے ایک مفلس دور میں اسکی ماں سے زیور اور نقدی لے چکا تھا۔ اس کا یہ اقدام اُسکے لئے ایک گالی بن چکا تھا اور وہ اس گالی کو ہمیشہ پھیکی ہنسی کے ساتھ گوارا کر رہا تھا۔ مگر جب پلٹے پیٹتے اس کی غیرت نیم مردہ اور بے حال ہو گئی تو وقت کو اُس پر رحم آگیا اسکی مالی حالت سنبھل گئی اور اُس نے اپنی بیوی سے خاموش انتقام لینا شروع کر دیا۔ اس نے اپنی تمامتر توجہ دوسری بیویوں کی جانب مبذول کر دی۔ قیصر حیران و ششدر یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ ماں اور باپ دونوں بیک وقت اسے ظالم اور مظلوم نظر آنے لگے۔

قیصر کے باپ نے یکے بعد دیگرے تین شادیاں کی تھیں۔ قیصر تیسری بیوی سے تھا۔ وہ کافی عرصہ تک یہ نہ سمجھ سکا کہ اُسکے باپ نے تین شادیاں کیوں کی ہیں۔ انسان ایک سے دوسری شادی کیوں کرتا ہے۔ بیوی بدصورت ہو، اپاہج ہو جائے۔ انتقال کر جائے، اولاد نہ ہوتی ہو یا پھر آوارہ ہو۔ مگر ناصر خان کی تینوں بیویاں خوبصورت تھیں، تینوں کی صحت اچھی تھی، تینوں ہی سے اولاد تھی لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی اور تینوں شریف بھی تھیں۔

قیصر کی ماں کے بعد ناصر خان نے پھر کوئی شادی نہیں کی تھی نہ جانے کیوں اور کیسے وہ اس پر حاوی تھی۔ وہ اُٹھتے بیٹھتے ناصر خان کو کسی نہ کسی عنوان ملامت کرتی رہتی۔ شاید اس کے میکے میں لڑکیوں کو اسی قسم کی تربیت دی جاتی تھی یا پھر وہ یہ سوچتی تھی کہ مرد کو جوتے کے نیچے رکھنا چاہیئے تاکہ وہ پاسِ عزت کے باعث ایسا کوئی اقدام نہ کرے جو عورت کے مفاد کے منافی ہو۔

وہ جب کبھی تینوں سوکنوں کی لڑائی میں اپنے باپ کی بے بسی دیکھتا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ اُسے یوں محسوس ہوتا کہ ایک لاچار تنکے کی طرح پانی کا تیز بہاؤ اُسکے باپ کو بہائے لئے جا رہا ہے اور تنکا قوتِ مدافعت سے عاری موجوں کے تھپیڑے کھا رہا ہے۔ یوں تو تین بیویاں اور اولاد کی کثرت ناصر خان کیلئے باعثِ رحمت تھی مگر اندرونِ خانہ وہ حبس اندوہگیں اور روح فرسا ماحول

میں دم توڑ رہا تھا اس کا کسی کو علم نہ تھا۔ خان کے رکھ رکھاؤ اور وضع داری میں بھی فرق نہ آیا تھا وہ جب گھر سے باہر نکلتا تو اپنے تمام زخم سنجیدگی کی مقدس چادر میں چھپا لیتا اور اپنے مرغی خانے کے لئے دانہ جمع کرنے لگتا۔ اس مرغی خانے میں اس نے جتنے بھی مرغ اور مرغیاں پال رکھی تھیں اُسے سب کی فکر تھی۔ کوئی بھوکا نہ رہ جائے اور کوئی بیمار نہ ہو جائے۔ ان کی آسودگی کیلئے اُسے کیسے کیسے دامِ فریب پھیلانے پڑتے۔ کئی بھولے بھالے اس دامِ فریب میں پھنستے۔ وہ سب کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالتا اور اپنی کاروباری ذہانت سے مال کے دُگنے پیسے وصول کرتا۔ ان پیسوں سے سب کے لئے آسائیشیں خریدتا۔ سب کے لئے مسرتوں کے پھول جمع کرتا اور پھر سب کچھ اُن کے حوالے کر کے کانٹوں کے بستر پر سو جاتا۔ اپنے باپ کا یہ معمول بھی اُسے پسند نہ تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا باپ مکر و فریب سے روپیہ اکٹھا کر کے دوسروں کے کیلئے آسائشیں مہیا کرے اور خود سکونِ قلب سے محروم رہے۔ اپنے قہقہے دوسروں کو دیدے اور خود آہوں میں بسر کرے اپنی مسرتیں اولاد کے قدموں پر نچھاور کر دے اور خود غم و اندوہ کے سائے میں پڑا رہے لیکن ابھی تک اسکی اپنی حیثیت بھی تو ایک سوالی کی سی تھی۔ وہ ابھی اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہوا تھا۔ آخر ش ایک دن ایسا بھی آیا کہ اس کا اجلا دماغ کثرتِ ازدواج اور کثرتِ اولاد کے گندے ماحول سے باغی ہو گیا۔

گھر سے نکل کر قیصر کی زندگی نے نیا جنم لیا۔ اُس کے شعور نے اپنے لئے نئی راہیں متعین کیں اور اس کے شب و روز معاشرے میں پلتے ہوئے اس ظلم کے خلاف ایک مضبوط محاذ بنانے میں گذرنے لگے۔ مگر معاشرے پر ایک مخصوص طبقے کی حکومت نے قدم قدم پر خاردار تار بچھا رکھے تھے۔ اُس نے یہ رکاوٹیں ہٹانے کی انتھک کوشش کی۔ اس سعی میں اُس کے ہاتھ پاؤں زخمی ہو گئے۔ وہ گھر سے یہ عہد کر کے نکلا تھا کہ معاشرے کی اس رسم کے خلاف علمِ بغاوت بلند کریگا جس نے مذہب کے مقدس نام پر اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے۔ ایک سے زائد شادی اس کے

نزدیک حرام تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری بیوی لائی جائے اور ایک بیوی کی اولاد کا مستقبل دوسری بیوی کی اولاد آنے کے بعد تاریک کر دیا جائے۔ پھول پاؤں میں مسل دیئے جائیں اور کانٹے گلے کا ہار بنا لئے جائیں۔

اسی کشمکش میں قیصر کے کئی برس بیت گئے اور جب اس کی آواز کو وقت کی قوت نے سہارا دیا تو اُس کے ساتھ کئی آوازیں شامل ہو گئیں۔ ان آوازوں میں عذرا کی آواز بھی تھی۔ عذرا سے اس کی شادی اسی کشمکش کے دَور میں ہوئی تھی۔ یہ شادی یوں تو محبت کی شادی تھی مگر پس پردہ اُس مقصد کی اکائی تھی جس کی خاطر قیصر نے اپنا گھر چھوڑا تھا۔ زمانہ کب کسی سے وفا کرتا ہے، اس نے ہر اُس شخص کی راہیں دشوار بنائی ہیں، جو اس کے حسین فریب میں آیا ہے۔ قیصر اور عذرا بھی اس کے فریب سے بچ نہ سکے۔ ان کی زندگی دو حصوں میں بٹ گئی اور وہ دونوں اپنی اپنی دانست میں ایک بھولے کبوتر کی طرح پھنس چکے تھے۔ ایک طرف شکرِ محبت تھا تو دوسری جانب پچھتاوا۔ جب پچھتاوا گھر میں سر اُٹھاتا تو قیصر اپنے آپ کو اس بھری دنیا میں تنہا پاتا اور زندگی میں غم اور آنسوؤں کے سوا اُسے کچھ نظر نہ آتا۔ مگر جب شکرِ محبت اس کے غم زدہ دل کو سہارا دیتا تو وہ اپنی جھولی میں مسرتوں کے پھول پاتا اُسے چاروں طرف اپنے بچوں کے مسکراتے ہوئے چہرے نظر آتے اور وہ اسے ہی بھرپور زندگی سمجھنے لگتا۔ یہی حال عذرا کا تھا۔

شجرِ ممنوعہ

جب سے عظمتِ آدم نے پہلی سانس لی ہے۔
اس آسمان کے نیچے
شکستِ آدم اپنی تمام تر شرمساریوں کے باوجود سر اٹھا کر یوں چل رہی ہے گویا آسمان سے ٹکرے گی۔ آسمان سے ٹکر لینے والوں میں کتنوں کا پتا پانی ہو گیا، کتنے اپنی موت آپ مر گئے لیکن آسمان کی گردش نہ تھمنی تھی نہ تھمی۔

اُس کے باپ نے غلام خریدنا شروع کئے۔ بھلا غلام خریدنے سے آتشِ نمرود گلزار ہو سکتی ہے اور سقراط زہر کا پیالہ پینے سے بچ سکتا ہے۔ آتشِ نمرود گلزار کرنے کیلئے ابراہیم کا کردار کہاں سے آئے گا۔ اور سقراط کو زہر کے پیالے سے بچانے کے لئے دانشور اپنی فہم و فراست کی عظمت کہاں سے لائیں گے۔ غلام خریدنے والا باپ تو اپنی بیٹی کا دل بہلا رہا تھا۔ بیٹی اپنے حسنِ عالمتاب کی تمام قیامتیں سمیٹ کر آسمان سے بھی اونچی اڑان اُڑنا چاہتی تھی۔ وہ ہر شب باپ کے خریدے ہوئے غلام کو اپنے سامنے بلاتی۔ اس کی اُٹھی ہوئی ناک کو اپنے حضور رگڑواتی اور پھر اُسے قتل کروا دیتی۔

اُس شمعِ حسن کے چرچے جتنے عام ہو رہے تھے اتنی ہی پروانوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ گو پروانے اپنے انجام سے بے خبر نہ تھے مگر پھر بھی سب کی یہ خواہش تھی کہ جلوۂ نیم شبی سے محروم نہ رہ جائیں خواہ ان کی زندگی کا عرصہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو۔ ملک بھر میں اسکی حیثیت شجرِ ممنوعہ کی سی تھی جسکا پھل چکھنے کیلئے ہر شخص بے چین نظر آتا تھا اور چکھنے کے بعد جنت سے نکلے ہوئے آدم کا انجام بھی جانتا تھا مگر فطرتِ آدم کب اس امر سے باز رہ سکتی ہے جس کے لئے حکمِ امتناعی صادر کیا جائے۔

اُس کا باپ اپنی عظمت کے جھروکوں سے جھانک کر منظر دیکھتا رہتا اور حقارت سے ہر آنیوالی صبح کا اس لئے انتظار کرتا کہ ابنِ آدم کی شکست ایک بے جان لاش کی شکل وصورت میں اُسکے سامنے آئے گی اور اسکے احساسِ برتری کو تسکین ملے گی۔ وہ ایک ہوشیار قصائی کی طرح غلام خریدتا۔ ان کی عمر کا اندازہ دانت گن کر تو نہ کرتا مگر ان کی توانائی اور خدوخال سے اُسے اندازہ ہوجاتا کہ غلام کے خون میں کتنی گرمی ہے۔ یوں تو اُس کی بیٹی سراپا گلستانِ رنگ و بو تھی مگر اس کا کردار اُس آدم خور خاردار جھاڑی کی مانند تھا جس کی شاخیں دلہن کی آغوش کی طرح وا رہتی تھیں اور جب کوئی اس آغوش میں محبت کے گیت گانے پہنچ جاتا تو وہ اپنی گرفت سخت کر دیتی حتیٰ کہ محبت کا گلا گھٹ جاتا اور وہ بے جان اس کے قدموں میں گر جاتی۔ شکستِ آدم اس لاش پر شرمساری کا نوحہ گاتی اور یوں ایک شب کی کہانی ختم ہو جاتی

باپ غلام خریدتا رہا۔ بیٹی غلاموں کو قتل کرواتی رہی۔ فطرتِ آدم شجرِ ممنوعہ کا پھل چکھتی رہی۔ ماہ و سال کی خون آشام راتیں نت نئے شوہر کو اپنی زلفوں کے سائے میں حجلۂ عروسی میں لے جاتیں اور صبح اُنھیں سفید کفن پہنا کر آرزوؤں کے قبرستان میں دفن کر دیتیں۔ وقت کی دانا آنکھوں نے آتشِ نمرود کو بھی دہکتے دیکھا تھا۔ اُس نے سقراط کے لبوں سے لگا ہوا زہر کا پیالہ بھی دیکھا تھا۔ اس نے کردارِ ابراہیم کی خوشبو بھی سونگھی تھی۔ اُس نے غلاموں کی منڈی لگتے بھی دیکھی تھی۔ اور ہر شب گلوں کی سیج پر سونے والی ہوس کا بھی نظارہ کیا تھا مگر جب اس کی نظران مناظر سے تھک گئی تو اس نے اپنے دستِ عدل کو جنبش دی اور نرم و نازک برش سے اس حسنِ مجسم کے خدوخال میں تغیر و انحطاط کے رنگ بھرنے لگا۔ رفتہ رفتہ اس بت کا شوخ و شنگ رنگ و روپ پھیکا پڑنے لگا۔ اس کے شانوں پر بل کھاتے ہوئے ناگ کینچلی بدلنے لگے۔ اس کے ہونٹوں کا تبسم زندھنے لگا، اُس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑنے لگی۔ رخسار صحنِ گلشن سے نکلے ہوئے پھولوں کی طرح مرجھانے لگے اِسکے

جسم کا کساؤ ٹوٹے ہوئے پلنگ کی طرح جھلنگا ہو گیا اور جب اسکے سڈول بازو ٹوٹی ہوئی کمند کی طرح اب مزید تیر چلانے کی توانائی کھو چکے تو اُس نے مڑ کر دیکھا۔ غلام خریدنے والا باپ مانے کی چتا پر جل چکا تھا اور اس کے پھول لعنتوں کے دریا میں بہائے جا چکے تھے۔ وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر اُٹھی اور اس قبرستان میں پہنچی جو اسکے حسنِ خون آشام کی ہوسناکیوں سے بھرا پڑا تھا۔ اُس نے اپنے جھکے ہوئے سر کو اُٹھانے کی کوشش کی مگر وہ اُٹھ نہ سکا۔ اب وہ قیامتیں سمیٹ کر آسمان سے اونچی اُڑان اُڑنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ وہ تھوڑی دیر اس قبرستان کا نظارہ کرتی رہی پھر نہ جانے اُسے کیا خیال آیا کہ اُٹھی اور اپنی کمر پر ہاتھ رکھے اُسی خوابگاہ میں واپس گئی جس میں لاتعداد جوانیوں نے زہر کا پیالہ پیا تھا اور سینکڑوں شباب آتشِ عشق میں جل کر راکھ ہو چکے تھے۔

جب وقت کی کمند نے اُسے بلندی سے نیچے پھینکا تو اُس کے احساس نے پہلی بار ایک خلش محسوس کی اور اب وہ جھروکے میں بیٹھی ہر راہگیر کو ایک بھکاری کی جھولی کی طرح خالی آنکھوں سے دیکھنے لگی مگر کسی راہگیر نے اس کی جھولی میں ایک کھوٹا سکہ بھی نہ ڈالا کہ وہ اسے ہی اپنی زندگی کا آخری سہارا سمجھ لیتی۔ معاشرہ اُسے بھول جانا چاہتا تھا اُسی طرح جیسے اُس کے باپ کو بھول چکا تھا اور وہ ایک بے آبرو طوائف کی طرح جھروکے میں بیٹھی ہر راہگیر کی نظرِ کرم کی محتاج نظر آنے لگی۔ طوائف کے کوٹھے پر تو بہت سے شریف چھپ چھپا کر پہنچ جاتے تھے مگر اس کے جھروکے پر کسی کی نظر نہ اُٹھتی تھی۔ وہ ایک بوڑھی نائکا کی طرح اپنے گم گشتہ شباب کی نوحہ گر نظر آنے لگی جو ہر شب نوحہ گری میں گذارتی ہے اور ہر صبح نوچیوں سے اپنے تجربہ کا خراج وصول کرتی ہے۔ اس کے پاس دولت تھی مگر اب اسکی دولت غلام خریدنے کے کام نہ آتی تھی۔

گرمیوں کی ایک بھری دوپہر کو وہ جھروکے میں بیٹھی اداس راہوں کے خطِ تقدیر پڑھ رہی تھی کہ اُسے اپنے دروازے پر ایک شخص کے گرنے کی آواز آئی۔ اُس نے جھک کر دیکھا۔ اجنبی کی شرمسار نظریں اُس سے ملیں اور اتصالِ نگاہ نے نہ جانے اُس سے کیا کہا کہ وہ چشم زدن میں سیڑھیاں چڑھ گیا۔ جوانی کی زرد دھوپ نے اُس کا خیر مقدم کیا۔ اجنبی غیر ارادی طور پر اس کے قریب پہنچ گیا اور خاردار جھاڑی کے بازو کھل گئے۔ مگر اب اس کے کانٹے جھڑ چکے تھے۔ اجنبی اس کے اندازِ سپردگی میں ایسا کھو گیا کہ اُسے گھر کا ہوش نہ رہا۔ اسکے شب و روز غزالہ کی ریشمی زلفوں کے سائے میں گذرنے لگے جن میں وقت نے کمال چابکدستی سے چاندی کے تار گوندھ دیئے تھے۔ وہ اس کی میخانہ بدوش آنکھوں کے سہارے جینے لگا جن میں ایک آخری جام کے سوا کچھ باقی نہ رہا تھا۔ چراغ بجھنے سے پہلے بھڑکتا ہے وہ بھی چراغ کی مانند تھی۔ یہ آخری شعلہ اتنا بھرپور تھا کہ فرخ نے ناموسِ خاندان اس کی لپیٹ میں دیدی۔ جب اس کی داستانِ عشق جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور عوام کی زبان پر حاکمِ ضلع کا معاشقہ عام ہو گیا تو امیرِ وقت نے لوٹ لگائی۔ سابق حاکمِ ضلع کی بیٹی اب کوٹھے پر بیٹھ چکی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس کا محل چکلے کی حدود سے باہر تھا۔ امیرِ وقت نے حکم صادر کیا کہ اس کی مملکت سے چکلے اور ماڈرن سوسائٹی گرلز کے کوٹھے شہر پناہ سے باہر کر دیئے جائیں جیسے کہ بھینسوں کے باڑے شہر سے باہر پھینکے گئے تھے تاکہ گندگی سے شہری فضا پاک ہو جاتے۔ عوام حیران تھے کہ ایک حاکمِ ضلع کی بدنامی سے متاثر ہو کر امیرِ وقت نے اتنا اہم اقدام کیا ہے مگر کیا اُس کے کان آجتک بند تھے جب چکلے کے گلی کوچوں میں سینکڑوں شرفا کی عزت نیلام پر چڑھتی تھی۔ کسے مجالِ سوال تھی اور کون پوچھ سکتا تھا کہ خود امیرِ وقت کے حرم میں تین سو عورتیں کیوں ہیں؟ چکلے شہر پناہ کے باہر کیوں جا رہے ہیں اور ایک بڑا چکلہ امیرِ وقت کے محل میں کیوں باقی رہے گا۔ لیکن وہ مملکت کا فرمانروا ہے۔ اس کی سلامتی کی دعائیں اب بھی مسجدوں میں مانگی جاتی ہیں۔

اس کے نام کا خطبہ اب بھی پڑھا جاتا ہے اور آئندہ بھی پڑھا جائے گا، خواہ وہ اپنے حرم میں تین سو عورتیں اور ڈال لے۔ وہ اس کے کام آئیں یا نہ آئیں یہ دیگر بات ہے۔

امیر وقت کے حکم کی فوری تعمیل ہوئی۔ شرفا کو شہر پناہ سے باہر جانے میں کافی سہولت مل گئی۔ اب انہیں چھپ چھپا کر جانے کی ضرورت نہ تھی۔ اب شہری انہیں دیکھ نہ سکتے تھے البتہ ان محرم راز لوگوں سے اخفا کی ضرورت نہ تھی جو خود اس حمام میں ننگے تھے۔ اس حکم کے بعد حاکم ضلع نے غزالہ کو اس کے محل سے منتقل کر کے ایک ذاتی مکان میں ڈال لیا تھا۔ حاکم کی تقلید کئی شرفا نے کی۔ اب طوائفوں کے انداز شریف زادیاں اپنانے لگیں۔ انگشت نمائی کی مجال کسی کو نہ تھی جب خود شرفا کے حرم سرا طائفہ بن گئے تو شریف زادیوں کو گھٹ گھٹ کر مرنے کی ضرورت باقی نہ رہی۔ آزادی تو اس طوطے کو بھی چاہیئے جو پنجرے میں میٹھا مالک کی سدھائی ہوئی بولی بولتا ہے خواہ وہ اس کی زبان چوری کھلا کر بدلے یا ہری مرچ۔ وہ جبتک اس پنجرے میں رہے گا مالک کی بولی ہی بولے گا۔ موقع سے فائدہ وہ بھی اُٹھاتا ہے۔ پنجرے کا دروازہ کھلتے ہی اُڑ کر اپنے ہم جنسوں میں پہنچ جاتا ہے ہمجنسوں کی صحبت کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔

غزالہ کی دولت اور حاکم ضلع کی اندھی کمائی کا جب آپس میں گٹھ جوڑ ہو گیا تو امیر وقت نے مصلحتاً دونوں کو شرفِ باریابی بخشا۔ جب دونوں حضورِ امیر حاضر ہوئے تو حاکمِ ضلع باہر کھڑا رہ گیا اور وہ حرم میں پہنچ گئی۔ بڑی مچھلی نے چھوٹی مچھلی کو نگل لیا۔

مردوں کے دوش بدوش

"دیکھو، دیکھو شوکت وہ کودی ۔" جمیل نے کہا ۔

پانی میں کودنے کی آواز نے جیسے کہ ستار کے تار چھیڑ دیئے اور نغموں کا ارتعاش تمام فضا میں پھیل گیا ۔ وہ مردوں کی صفیں چیرتی ہوئی جی دار شیرنی کی طرح سیدھی تالاب کے دوسرے کنارے پر پہنچ گئی ۔

مردوں کے ہجوم میں وہ اندر کے اکھاڑے کی اپسرا معلوم ہو رہی تھی ۔ اُس کے سڈول جسم میں زندگی دھڑک رہی تھی اور شوکت اس کی دھڑکتی ہوئی زندگی کو للچائی ہوئی نظروں سے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے کوئی بچہ کسی سجی ہوئی دوکان پر کھلونوں کو دیکھتا ہے لیکن انھیں خرید نہیں سکتا ۔

جب سے وہ جیمخانہ کی ممبر بنی تھی وہاں کے درو دیوار پر سبزہ اُگ آیا تھا ۔ یوں تو کئی ممبر عورتیں جیمخانہ کی رونق کا باعث تھیں لیکن نیلی کی آمد بہار بداماں تھی ۔ ہر طرف رنگا رنگ پھول کھل گئے تھے ۔ پژمردہ چہروں کو گلاب نے اپنی سرخیاں فیاضی سے بانٹ دی تھیں اور وہ ان رنگارنگ پھولوں میں بہار کی شہزادی بنی رقصاں و شاداں پھر رہی تھی ۔ وہ جدھر سے گزرتی نظریں سورج مکھی کے پھول کی طرح اُس کی جانب مڑ جاتیں اور وہ مہر عالمتاب بنی قلب و نظر کو گرماتی ہوئی سوسائٹی کو روشن کر رہی تھی ۔

اب جیمخانہ کے ہر کونے میں نئے قصے سنائے جاتے اور قصہ خوان اس کا قصہ یوں مزے لیکر سناتے جیسے کہ شہد چاٹ رہے ہوں ۔

رفتہ رفتہ اس کی شہرت افسران کے حلقۂ نظر سے آنکھیں بچا کر شہر کے کوچہ و بازار میں

پہنچ گئی اور جوق در جوق ہر حربی نی اور روپے نے لب مقناطیس کے سامنے آنا شروع کر دیا۔ مقناطیس کی کشش نے بڑے بڑے بیوپاریوں کی دولت جیبخانہ میں لاکر ڈالدی۔ بڑی تیزی سے اچکنیں اور سوٹ سلنے لگے اور اُمیدوروں نے اپنے ڈرائنگ روم سجانے شروع کر دیئے۔ دن رات فلش اور رمی کا دور چلنے لگا۔ وہ جس ٹیبل پر بیٹھ جاتی جیبیں الٹ لیتی۔ نہ جانے لوگوں کو اس کے سامنے ہارنے میں کیا مزہ آتا تھا اور اُسے جیت کے نشے میں مخمور دیکھ کر وہ اپنے دل کے کس جذبہ کو تسکین پہنچاتے تھے۔ البتہ اتنی بات ضرور سمجھ میں آتی تھی کہ نیلی مردوں کی نفسیات کی ماہر ہے۔ وہ مرد کی نظر کو اتنی تیزی کے ساتھ سمجھتی تھی کہ جنبشِ نظر کو زحمتِ انتظار کبھی اٹھانا نہیں پڑی۔

بیگم لوزی تو اُسے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی چونکہ وہ جیم خانہ کی ممبر ہوتے ہوئے بھی اپنے شوہر کے بغیر کسی مرد کے پاس علیحدہ بیٹھنا گوارا نہیں کرتی تھی۔ نیلی کا خیال تھا کہ وہ پڑھی لکھی جاہل ہے جسے مردوں کے دوش بدوش چلنے کا شعور نہیں یا جیسے بوڑھی گھوڑی کے منہ میں لال لگام دے کر لوزی ریس کورس کے میدان میں لایا ہے لیکن وہ جاکی کے سائے سے بدکتی ہے۔

نیلی نے کل ہی اپنی گھوڑی "بادِ صبا" کو محض اس لئے ایک ہزار روپیہ نقصان میں فروخت کر دیا تھا کہ وہ جاکی کو اپنی پیٹھ پر بیٹھنے نہیں دیتی تھی اور اگر اتفاق سے کوئی تجربہ کار جاکی بیٹھ بھی جاتا تو وہ ریس میں دوڑتے ہوئے اُسے پیٹھ پر سے گرا دیتی۔ نیلی کو گھوڑی کی یہ عادت پسند نہ تھی اور اب اُس نے عہد کر لیا تھا کہ کسی نہ کسی طرح شوکت کا ترکی النسل گھوڑا "تختِ رواں" حاصل کرے جس کے لئے اُس نے اپنے میاں کو اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ شوکت سے دوستی بڑھائی جائے۔

اُس کا میاں نصیر پولیس میں درمیانہ عہدے پر فائز تھا۔ نیلی کے باعث ہر محفل میں اس کی آؤ بھگت ہوتی اور وہ اس اعزاز کو اپنی ملازمت سے زیادہ وسیع سمجھتا تھا۔

پولیس افسر کی حیثیت سے وہ جس قدر بالغ نظر اور عیب جو تھا اتنا ہی اپنی سب سے بڑی کمزوری کے معاملہ میں چشم پوش بھی تھا۔ اُس نے نیلی سے کبھی بھول کر بھی نہیں پوچھا تھا کہ میرے گھر میں تحائف کا انبار اور رنگارنگ اشیاء کہاں سے آتی ہیں۔ انہیں کون لاتا ہے اور ایسے کون سے شرفاء ہیں جنہیں اپنا گھر سجانے کی بجائے میرے گھر کو دلہن بنانے کی زیادہ فکر ہے۔

تنخواہ تو اُسے واجبی ہی ملتی تھی، لیکن بالائی آمدن پر خدا کا فضل بے حد مہربان تھا اُس کی چھوٹی ٹمائش کی سج دھج دن دونی اور رات چوگنی ترقی کر رہی تھی۔ نیلی اگر دن میں دو ساڑھیاں لاتی تو رات کو چار زیور خود بخود اس کے گھر میں پہنچ جاتے اور وہ اس ترقی کے گھوڑے پر سوار گرد و پیش سے باخبر ہوتے ہوئے بھی بے خبری میں چلا جا رہا تھا۔ جبھی تو اُسے نوری کی صاف گوئی پسند نہ تھی۔ لیکن ایک دن جب نوری نے اُسے معطل ہونے سے بال بال بچالیا تو اُس نے کہا۔

"نوری بھائی۔ آخر پولیس والے بیچارے کیا کریں۔ کام تو حکومت ان سے نظم و نسق کو قائم رکھنے اور قانون کی محافظت کا لیتی ہے لیکن تنخواہ اتنی قلیل دیتی ہے کہ کوئی افسر اپنی پوزیشن قائم نہیں رکھ سکتا۔ میرا ضمیر بھی جائز و ناجائز کی اہمیت کو سمجھتا ہے لیکن بھوکا انسان تو سؤر بھی جائز سمجھ کر کھا جاتا ہے۔ زندہ جو رہنا ہوا۔"

آج جب وہ تیرتی ہوئی تالاب کے دوسرے کنارے پر پہنچی تو اُس نے شوکت پر ایسی تیکھی نظر ڈالی کہ وہ اس بھرپور وار کی تاب نہ لا سکا۔ اور اپنی بیتابی کو چھپانے کے لئے پانی میں ڈبکی لگا گیا۔ وہ بھلا کب چوکنے والی تھی، اُس نے موقع کو تیزی سے اپنی گرفت میں لیا اور خود بھی ڈبکی لگائی۔ تالاب میں دوسرے نہانے والوں نے صرف Sorry سنا۔ دو مسکراہٹیں آنکھیں ملتی ہوئیں سینۂ آب پر نمودار ہوئیں اور تالاب کی گستاخ نگاہوں نے شکست خوردہ تبسم کا جلوس دوسرے کنارے کی جانب جاتا دیکھا۔

وقت کو جیسے پَر لگ گئے اور شوکت نے اپنے شب و روز کے لمحات ایک کر دیئے اُس نے اپنی گھڑی کو کنا بند کردی اور اب اس کی نظریں جیم خانہ کی برقی گھڑی پر تھیں جسے کو کنے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ ایک قوت اُسے خود بخود چلا رہی تھی۔ اب سجی ہوئی دوکان کا ہر کھلونا اُس کا ہو چکا تھا۔ اُسے خریدنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ وہ بلا روک ٹوک اُنہیں چھو سکتا تھا۔ اگر کسی وقت نادانستہ طور پر اُس کا ہاتھ کسی کھلونے پر سخت پڑ جاتا تو دوکاندار اُسے بڑے پیار سے کھیلنے کا طریقہ بتا دیتا اور اس کی خطا معاف کر دیتا۔ وہ گھر چھوڑ کر دوکاندار کا ہو گیا۔

آج "تختِ رواں" نے والسرائے کپ جیتا۔ اُس کی لگام نیلی کے ہاتھ میں دیکھ کر بیگم نوری نے آہِ سرد کھینچی اور اپنے میاں کی جانب نہ جانے کیسے دیکھا کہ اُس نے ریس کی کتاب کے ورق پھاڑنا شروع کر دیئے۔ نیلی نے بھی طنز میں ڈوبی ہوئی نظر بیگم نوری پر ڈالی جیسے کہہ رہی ہو۔ میرے گھوڑے اور اپنی لال لگام کو دیکھ۔ تو جاکی سے بدکتی ہے اور میں گھوڑے سے بھی نہیں گھبراتی۔ اس کی لگام میرے ہاتھ میں ہے۔

وہ مسکراتی ہوئی اپنے میاں کے بازو میں ایک ہاتھ ڈالے اور دوسرے ہاتھ میں گھوڑے کی باگ تھامے اِٹھلاتی ہوئی رِیس کورس سے نکلی۔ آج شوکت پھولا نہیں سماتا تھا چونکہ اُسکے تختِ رواں" کی باگ نیلی کے ہاتھ میں تھی، لیکن نہ جانے کیوں گھوڑے کی سرخ آنکھیں بار بار شوکت کو گھور رہی تھیں۔

نیلی نے دوسری شب ایک شاندار دعوت کا انتظام کیا۔ جس میں رلیس کے رسیا اور جیمخانہ کے تمام ممبر شامل تھے۔ شراب کا استعمال انوکھے طریقے سے ہو رہا تھا۔ تمام میزوں پر ٹی پاٹ اور کپ ساسر چنے ہوئے تھے اور ہمارا ترقی پسند معاشرہ شراب بندی کے آداب سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ گو نیلی چاروں جانب تھرکتی پھر رہی تھی لیکن اس کی نظریں شوکت کو تلاش کر رہی تھیں۔ جب محفل پورے رنگ پر آ گئی تو

نیلی ڈانس کے لئے بے چین نظر آنے لگی۔ اور اس کا شوخ چہرہ پھیکا پڑنے لگا۔ لیکن جب شوکت ہال میں داخل ہوا تو نیلی کا چہرہ فرطِ مسرت سے تمتما اُٹھا۔ دفعتاً وہ پھر پھیکی سی پڑ گئی جبکہ شوکت نے اس کے نزدیک آکر اپنے ساتھ آنے والے دوست کا اُس سے تعارف کردایا۔ نیلی نے اُس کے دوست پر عجب سی نظر ڈالی جیسے کہ وہ اُسے جچا نہیں۔ آنے والا پست قد، بیٹھی ہوئی ناک، موٹی موٹی آنکھیں، گہرا سانولا رنگ اور پھیلے ہوئے کانوں کا ایک مجسمہ تھا جسے کسی بت تراش نے بیدلی سے بنایا ہو یا وہ کسی مصور کے آڑے ترچھے برشوں کی سہمی ہوئی کہانی ہو۔ نیلی نے دل کڑا کر کے اُس سے ہاتھ ملایا۔ اُس کے چہرے سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کڑوا بادام کھا گئی ہو۔ لیکن نہ جانے رفعت کے ہاتھ میں کون سی برقی قوت تھی جو نیلی کے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ نیلی نے اپنے مخصوص اندازِ تبسم کی جھلک اُسے بھی بخشی اور اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لئے اُس میز کی جانب چلی جس پر اُسے شوکت اور اپنے میاں کو بٹھانا تھا۔ اب میاں کی جگہ رفعت نے لی اور نصیر مجبوراً لوزی کے پاس جاکر بیٹھ گیا چونکہ آج بیگم لوزی نے صبح ہی سے سیاہ ساڑھی باندھ لی تھی جب وہ سیاہ ساڑھی باندھ لیتی تھی تو ہفتہ بھر گھر سے باہر نہیں نکلتی تھی۔

رفعت نیلی کے اندازِ تبسم اور حسنِ سلوک سے مرعوب ہو چکا تھا۔ باتوں ہی باتوں میں نہ جانے کیوں اُسے آدابِ شکریہ بجالانے کی ضرورت پڑی کہ برقی قمقموں کی روشنی میں ایک روشن لکیر اُس کی انگلی سے نکل کر نیلی کی آنکھوں میں سما گئی۔ نیلی نے آداب کا جواب کچھ اس ڈھب سے دیا کہ رفعت اپنی بلندی سے نیچے اُتر آیا۔ نیلی مردوں کی نفسیات کی ماہر تھی، وہ مرد کی نظر کو تیزی کے ساتھ سمجھتی تھی۔ اُس نے ایک اور بھرپور وار رفعت پر کیا اور وہ بے حال ہو گیا۔ ٹی پاٹ کی شراب کپ میں آچکی تھی۔ وہ اُسے غٹ غٹ پی گیا اور پھر اُس کی گھنی پلکوں کے سائے میں کچھ تلاش کرنے لگا۔

تھوڑی ہی دیر میں رفعت کا تمام احباب سے تعارف ہو گیا اور سب اُس میں

دلچسپی لینے لگے چونکہ نیلی اس میں دلچسپی لے رہی تھی دفعتاً رقص کے نغموں نے سب کو چونکا دیا اور رقص کا پروگرام شروع ہو گیا۔ نیلی نے پہلے شوکت اور پھر رفعت کے ساتھ رقص کیا۔ رقص کے وقت رفعت کی بیش بہا انگوٹھی کی شعاعیں سب نے دیکھیں ــــ اور دوسری شام جب نیلی جیمخانہ میں آئی تو انگوٹھی اُس کے ہاتھ میں تھی۔

رفعت کو پاکستان آئے چار ماہ ہو چکے تھے۔ وہ ایک مرتبہ اپنے ویزا کی تاریخ بھی بڑھوا چکا تھا۔ روزانہ تار پر تار آ رہے تھے کہ وہ دہلی جلدی پہنچے۔ اُس کی بیوی سخت بیمار ہے لیکن اس وقت تو رفعت نیلی کے گلشنِ شباب کی گلچینی کر رہا تھا، اُسے اتنی فرصت کہاں تھی کہ جا کر بیمار بیوی کی تیمارداری کرتا۔

مرد جب بیوی کے پائیں باغ سے نکل کر محبوبہ کے چمن میں آتا ہے تو اُسے وہاں کے گل و ریحان زیادہ بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ اُسے ہر طرف بہار ہی بہار اور شباب ہی شباب کھیلتا نظر آتا ہے اور وہ اُس چار دیواری کی جانب لوٹنا نہیں چاہتا جہاں تبسم کی سادگی اپنے خلوص کو روزانہ دُلہن نہیں بنا سکتی۔

نیلی کو رفعت کی کیڈلاک بہت پسند تھی۔ وہ اُس گاڑی پر دور دراز کا سفر اختیار کرنا چاہتی تھی اور آج رفعت اُسے ایسے لئے جا رہا تھا جیسے جسارتِ گلچیں گل کی آبرو لوٹ کر صحنِ چمن سے نکل رہی ہو۔

اشتیاق حسین اظہر

نام :- اشتیاق حسین تخلص :- اظہر

پیدائش :- کانپور (یو۔پی) سنہ ۱۹۲۵ء - ہجرت ۔ سنہ ۱۹۴۷ء

تعلیم :- بی۔اے (کرائسٹ چرچ کالج کانپور)

موجودہ پتہ :- اسسٹنٹ ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و تعلقاتِ عامہ - خیرپور ڈویژن

مشاغل

نامہ نگار روزنامہ 'تنویر' لکھنؤ سنہ ۱۹۴۶ء - نامہ نگار روزنامہ 'ڈان' دہلی سنہ ۱۹۴۶ء

رکن ادارۂ تحریر روزنامہ 'انجام' کراچی سنہ ۱۹۴۷ء - رکن ادارۂ تحریر روزنامہ 'امروز' کراچی

(سنہ ۱۹۴۹ء تا سنہ ۱۹۵۳ء) افسر اطلاعات حکومتِ سندھ سنہ ۱۹۵۳ء - اسسٹنٹ ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات

مغربی پاکستان (سنہ ۵۷ء تا حال)

ادبی سرگرمیاں

سکریٹری بزم ادب کرائسٹ چرچ کالج کانپور (سنہ ۱۹۴۶ء) ناظم حسرت میموریل سوسائٹی اور حسرت میموریل لائبریری

کراچی سنہ ۱۹۵۵ء - صدر مرکزِ علم و ادب حیدرآباد (سنہ ۱۹۵۹ء) ممبر پاکستان رائٹرز گلڈ (سنہ ۱۹۵۹ء)

رکن مجلسِ عاملہ رائٹرز گلڈ - سکھر سب ریجن سنہ ۱۹۶۱ء تا حال

تصانیف :- ۱- مجموعۂ کلام - نغمہ و شعر مطبوعہ سنہ ۱۹۵۹ء ۲- مضامین کا مجموعہ (زیرِ ترتیب)

۳- مقالہ - شاہ حسن عسکری اور بہادر شاہ ظفر (مطبوعہ)

غزل

موت سے بد تر ہے مجھ کو زندگی تیرے بغیر
حادثوں سے ہو گئی ہے دوستی تیرے بغیر

اب کہاں صبر و قرارِ زندگی تیرے بغیر
یہ جوانی، یہ شبابِ دوستی تیرے بغیر

بھول بیٹھے رسم و راہِ عاشقی تیرے بغیر
اہلِ دل کی ہائے یہ بے مائیگی تیرے بغیر

یہ تصوّر کے گھروندے یہ خیالوں کے محل
ہو رہی ہے ان سے اب دلبستگی تیرے بغیر

دشمنوں کے تیر و نشتر دوستوں کے قہقہے
ہو گئے اپنے لئے سب اجنبی تیرے بغیر

تیرے دم سے دوست بھی تھے ہمدم و دمساز بھی
ہائے یہ ماحول کی بیگانگی تیرے بغیر

بے قراری بن گئی وجہِ قرارِ زندگی
مل گیا دل کو سکونِ دائمی تیرے بغیر

اب جیوں کس کے لئے زندہ رہوں کس کے لئے
ہے قیامت دو گھڑی کی زندگی تیرے بغیر

اب برنگِ شعر ہے، اظہر بیانِ دردِ دل
کس قدر دلکش ہے شغلِ شاعری تیرے بغیر

○

حوصلے جینے کے مرگِ ناگہاں تک آ گئے
اے غمِ جاناں تجھے لیکر کہاں تک آ گئے

دیر و کعبہ بھی تھے دشوار غم کے مرحلے
پھر بھی ہم اے دوست تیرے آستاں تک آ گئے

واہ رے جرمِ محبت تیری رنگا رنگیاں
آج کچھ الزام اِک نامہرباں تک آ گئے

منزلِ دار و رسن بھی گردِ پا ثابت ہوئی
سرفروشانِ وفا آخر وہاں تک آ گئے

الوداع اے تابِ ہجراں المدد اے ضبطِ غم
دل کے احساسات اب لفظ و بیاں تک آ گئے

ماجرائے بیدلی و بےبسی اظہرؔ نہ پوچھ
ضبطِ غم کے ولولے جوشِ فغاں تک آ گئے

زندگی میں کچھ نہیں ان کی محبت کے سوا
اک مسلسل غم مسلسل رنج فرقت کے سوا

اعترافِ عشق و تائیدِ محبت کے سوا
میری ہستی کچھ نہیں اُنکی عنایت کے سوا

اُنکو مل سکتا نہیں ڈھونڈے سے کوئی جاں نثار
ایک پابندِ وفا مجبورِ الفت کے سوا

جب بھی ملتے ہیں تو کھاتے ہیں محبت کی قسم
خوبیاں ہیں ان میں سب مہر و مروت کے سوا

لاکھ ان پر جان چھڑکیں اور نچھاور دل کریں
کچھ بھی قسمت میں نہیں غم کی رفاقت کے سوا

دین و ایماں آپ کے دل آپکا جان آپکی
ہم کسے دنیا کہیں دردِ محبت کے سوا

آپ اگر چیں بر جبیں ہیں میرے نالوں پر تو ہوں
آپ سے ہم کو ملا کیا رنج و کلفت کے سوا

باتوں ہی باتوں میں ہوتا ہے بیانِ دردِ دل
قصۂ غم کچھ نہیں حرف و حکایت کے سوا

بزمِ جاناں میں گئے تھے ہم بڑی امید سے
کچھ نہ ہاتھ آیا رقیبوں کی عداوت کے سوا

آپ اس سے پوچھتے کیوں ہیں میرے احوال کو
غیر کے دل میں ہے کیا رشک و رقابت کے سوا

دہر میں اظہر کسی شے کو نہیں حاصل ثبات
اک حماقت خیز، غم آمیز الفت کے سوا

غزل

مسکراتے جائیں گے آنسو بہاتے جائیں گے
قصّۂ عہدِ وفا اُن کو سناتے جائیں گے

آرزوؤں کی نئی دنیا بساتے جائیں گے
ہم غمِ دوراں کو بھی اپنا بناتے جائیں گے

اُنکو بھی لازم ہے کچھ اربابِ محفل کا خیال
ہم کہاں تک رنجِ محرومی چھپاتے جائیں گے

وہ نکلتے ہیں ذرا سیرِ چمن کے واسطے
ہر قدم پر ایک نیا فتنہ جگاتے جائیں گے

ان کا اظہارِ وفا بھی ہے بہ اندازِ جفا
مسکراتے جائیں گے بجلی گراتے جائیں گے

ہم دکھائیں گے انھیں اہلِ وفا کے حوصلے
شدتِ آلام میں بھی مسکراتے جائیں گے

دوستی کب تک رہے گی حادثاتِ دہر سے
ان کے غم کو بھی رفیقِ دل بناتے جائیں گے

نالۂ بے نام، آہِ بے رسا، رنجِ فراق
اپنی بزمِ آرزو یوں ہی سجاتے جائیں گے

انکا غم، انکا تصور، انکی یاد، انکا خیال
ایک نئی دنیا محبّت کی بناتے جائیں گے

ہوگا کیا اظہرؔ ہمیشہ امتحانِ صبر و ضبط
کیا یونہی وہ اہلِ دل کو آزماتے جائیں گے

غزل

آپ پر قابو نہیں، قبضہ میں اپنے دل نہیں
ہم وہ رہبر ہیں کہ جن کی کوئی بھی منزل نہیں

ہر نفس سیلِ حوادث، ہر گھڑی طوفانِ غم
اہلِ دل کو فرصتِ نظارۂ ساحل نہیں

ہائے وہ رنگین لمحے، ابتدائے شوق کے
اب کسی صورت کسی عالم قرارِ دل نہیں

تم ہی بتلاؤ کدھر جائیں پرستارانِ غم
اب کوئی رہبر نہیں اب کوئی منزل نہیں

وہ تو کہئے، تیری یادوں کا سہارا مل گیا
ورنہ اتنی دل نشیں دنیائے آب و گل نہیں

خندۂ گل میں رہی، شورِ عنادل میں رہی
بے نتیجہ التجاؤں کا کوئی حاصل نہیں

آپ کو کیوں ہو رہی ہے خواہشِ ترکِ ستم
دوستی مشکل ہے لیکن دشمنی مشکل نہیں

یوں تو ہے رنگین بیحد داستانِ حسنِ دوست
اس میں لیکن سرخیٔ خونِ وفا شامل نہیں

دوستوں کی بزم ہو یا حلقۂ اغیار ہو
دل کسی لمحہ تمہاری یاد سے غافل نہیں

ہنستی اُطہر ہے ادر ہنگامۂ جہد و طلب
اور اس پر یہ ستم قابو میں اپنے دل نہیں

غزل

وہ سامنے ہیں حشر سا اک دل میں بپا ہے
ساحل پہ سفینہ ہے مگر ڈوب رہا ہے

غم ہو کہ خوشی زلیست کسی حد پہ تو ٹھہرے
دل کشمکشِ شوق سے گھبرانے لگا ہے

کیوں شام کے ہونٹوں پہ ہے آلام کی سرخی!
شاید کوئی اپنے کسی ساتھی سے خفا ہے

ملنا بھی قیامت ہے نہ ملنا بھی قیامت
یہ زلیست نہیں معرکۂ کرب و بلا ہے

کلیوں کا تبسم ہو کہ غنچوں کا تکلم
ہو گا وہی جو وقت کے ماتھے پہ لکھا ہے

اک وہ بھی زمانہ تھا وہ مائل بہ کرم تھے
اک یہ بھی زمانہ ہے زمانہ بھی خفا ہے

ہر لحظہ نوازش تھی غمِ کون و مکاں کی
پھر بھی غمِ جاناں نے بڑا ساتھ دیا ہے

اظہارِ محبت کی نہ جانے ہو سزا کیا؟
اقرارِ محبت پہ تو یہ حشر بپا ہے

یہ لفظِ محبت بھی عجب لفظ ہے اظہرؔ
ہر شخص کے ہونٹوں پہ اک افسانہ نیا ہے

○

زندگی کو بے نیازِ درد و درماں کیجئے
حسن والوں پر جو ممکن ہو تو احساں کیجئے

ذکرِ خوباں کے بجائے شکرِ درباں کیجئے
ان سے ملنا ہے تو پھر ملنے کا ساماں کیجئے

دامنِ ساحل میں تو امن و سکوں ملتا نہیں
کشتیٔ عمرِ رواں کو نذرِ طوفاں کیجئے

ان کی یادوں سے سجا لیجے خیابانِ خیال
اپنی بزمِ دل کو بھی رشکِ بہاراں کیجئے

تلخیٔ عالم سمو لیجے شرابِ شوق میں
کچھ نہ کچھ تو احترامِ یادِ یاراں کیجئے

اک زمانہ سے امینِ زندگی ہے یادِ یار
اب تو یادِ یار ہی سے عہد و پیماں کیجئے

بے نیازی کو بنا لیجے شعارِ زندگی
اور ساری آرزوئیں ان پہ قرباں کیجئے

جان دینی ہے تو دیجئے اُن کے پائے ناز پر
چلتے چلتے یہ بھی اک کارِ نمایاں کیجئے

اب تو ہر لحظہ نگاہوں میں ہے تصویرِ حبیب
کس توقع پر امیدِ شامِ ہجراں کیجئے

میں تو رہرو ہوں رہوں گا عمر بھر خانہ خراب
آپ کیوں میرے لئے خود کو پریشاں کیجئے

دیکے دل اظہر مآلِ غم سے کیا گھبرائیے
ان سے ملئے اور شکرِ رنج و حرماں کیجئے

وہ تو برہم ہیں مگر نظمِ حیا برہم نہیں
اہلِ دل کے واسطے یہ حادثہ بھی کم نہیں

حسن نادم ہے جفا پر گریۂ چشم نم نہیں
کون کہتا ہے کہ ربطِ آرزو محکم نہیں

صبح کی پہلی کرن سے پوچھئے رازِ حیات
زندگی اک شعلۂ بیتاب ہے شبنم نہیں

دل ہے اب بھی کشتۂ نیرنگیِ حالاتِ عشق
ہاں مگر وہ اضطرابِ شوق کا عالم نہیں

وجہِ تسکینِ دلِ برباد ہو سکتی نہیں
وہ نگاہِ ناز جو لذت شناسِ غم نہیں

پھر نہ دوں گا خاطرِ نازک کو تکلیفِ کرم
حسن کی چشمِ تمنا بھی مجھے کچھ کم نہیں

شاعری اظہر فقط ہے وارداتِ دل کا نام
لیکن اس رازِ حقیقت کا کوئی محرم نہیں

غزل

زندگی کو بے نیازِ این و آں کرتے چلیں
چلتے چلتے یہ بھی سعیٔ رائیگاں کرتے چلیں

ذکرِ منزل کارواں در کارواں کرتے چلیں
اپنے ذوقِ جستجو کا امتحاں کرتے چلیں

آشیاں کا تذکرہ ہو یا قفس کی داستاں
دل پہ جو بیتی ہے شرحِ داستاں کرتے چلیں

ہائے وہ آنسو جو زیبِ چشمِ پُرنم ہی رہے
آؤ اُن اشکوں کو زیبِ داستاں کرتے چلیں

بر بنائے مصلحت لائیں نہ لب پہ حرفِ شوق
قصۂ غم کو حدیثِ دیگراں کرتے چلیں

یہ بھی اک رخ ہے ملے شاید اسی صورت قرار
شعلوں کو شبنم بہاروں کو خزاں کرتے چلیں

اور اب ساغر میں بھر لیں گردشِ دوراں کا رنگ
پھر غمِ جاناں کو نذرِ دوستاں کرتے چلیں

خود غرض احباب نے اظہر دیئے کیا کیا فریب
آؤ اب شکرِ فریبِ دشمناں کرتے چلیں

دید کا ارماں تھا اور ارمان پورا ہو گیا
زندگی بھر کے مصائب کا سہارا ہو گیا

آنکھوں ہی آنکھوں میں اظہارِ تمنا ہو گیا
دیکھتے ہی دیکھتے ملنے کا وعدا ہو گیا

اُن کے جلوے تو نویدِ صبح ہیں کہتے نہ تھے
خونِ دل تاریکیِ شب کا مداوا ہو گیا

اب تو غم سے بھی نہیں ہوتی ہے تسکینِ حیات
ہائے یہ دل اور اتنا بے سہارا ہو گیا

شب کے سناٹے میں اتنی دلنشیں تھی یادِ دوست
کشتگانِ غم نے یہ سمجھا سویرا ہو گیا

شاید آجاتا اُنھیں ناکامِ الفت کا خیال
اب تو دل ناواقفِ حرفِ تمنا ہو گیا

اے نگاہِ ناز اب کچھ اور اندازِ ستم
حادثوں سے تو سرورِ عشق دونا ہو گیا

لوگ میرا نام لیکر یاد کرتے ہی رہے
مجھکو رسوا کرنے والا خود بھی رسوا ہو گیا

اب نہ درماں کا تجسس ہے نہ خواہش درد کی
آپ کا غم مل گیا غم کا سہارا ہو گیا

عہدِ غم کو بھول جانا کھیل ہے اظہر کوئی
ہاں مگر رونے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا

○

کیا ہوئے وہ دن کہ دل لذت کشِ ماتم نہ تھا
وصل کی حسرت نہ تھی ناکامیوں کا غم نہ تھا
تازگی ہونٹوں میں تھی معصومیت جلووں میں تھی
آنکھ میں سرمہ نہ تھا، زلفوں میں پیچ و خم نہ تھا
آنکھوں ہی آنکھوں میں ہوتے تھے بیاں جذباتِ شوق
حُسن انجام وفا میں عشق سے کچھ کم نہ تھا
زندگی گرمِ سفر تھی اور بغیر حادثات
ذہن میں اپنے کبھی موجوں کا زیر و بم نہ تھا
حُسن بھی اپنی جگہ تھا مطمئن اور عشق بھی
گلستاں میں امتیازِ شعلہ و شبنم نہ تھا
کون سی راحت تھی جو حاصل نہ تھی بے التجا
کون سا لطف و کرم پیہم نہ تھا ہر دم نہ تھا
یاد ہے اظہر ہمیں اب تک شروعِ عہدِ عشق
دل میں کوئی ڈر نہ تھا دل کو کسی کا غم نہ تھا

○

اُس نے قیدِ وفا بڑھائی ہے
یہ اسیری نہیں رہائی ہے

نکہتِ زلفِ یار آئی ہے
اے جنوں اب تری دُھائی ہے

چشمِ مست اُس نے پھر اُٹھائی ہے
اب کسے زعمِ پارسائی ہے

خار زارِ طلب میں آجلئے
جس کو رنجِ برہنہ پائی ہے

اللہ اللہ شکستِ دل کی صدا
زندگی آج مسکرائی ہے

گردشِ وقت نے ستایا ہے
کرمِ یار کی دُھائی ہے

جو نہ برسے نہ کھُل سکے اظہر
دل پہ ایسی گھٹا بھی چھائی ہے

○

دل کو کب لذتِ آلام سے ڈر لگتا ہے
ہاں مگر اس دلِ ناکام سے ڈر لگتا ہے

پھر زمانے کی نگاہوں میں کھٹکنے نہ لگوں
التفاتِ سحر و شام سے ڈر لگتا ہے

دل کی ہلکی سی خلش حسن نہ بن جائے کہیں
عشق کے جذبۂ بے نام سے ڈر لگتا ہے

کبھی آتا ہے ترے عہدِ محبت پہ یقیں
اور کبھی گردشِ ایام سے ڈر لگتا ہے

جاگ اٹھے نہ کہیں تشنگیٔ شوق و طلب
نگۂ مست کے پیغام سے ڈر لگتا ہے

بادۂ عشق سے محروم نہ ہو جاؤں کہیں
پرسشِ ساقیٔ گلفام سے ڈر لگتا ہے

میں ہراساں نہیں اے دوست شبِ فرقت سے
ہاں ترے وعدۂ بدنام سے ڈر لگتا ہے

اتنا مانوس ہوں طوفانِ الم سے اظہرؔ
دل کو ہر راحت و آرام سے ڈر لگتا ہے

○

جلوۂ غم سے منوّر بام و در کرتے چلیں
شام کے ہونے سے پہلے ہی سحر کرتے چلیں

زندگی ہے اک سفر آؤ سفر کرتے چلیں
جو بھی منزل آئے اس کو رہگزر کرتے چلیں

اس رُخِ روشن کی جانب اک نظر کرتے چلیں
شام آئے یا نہ آئے ہم سحر کرتے چلیں

چند لمحوں کے لئے بن کر سراپا انتظار
وعدۂ نا معتبر کو معتبر کرتے چلیں

آ گئے اب اس زندگی سے دل بہت بیزار ہے
داستانِ آرزو کو مختصر کرتے چلیں

گُل تو کیا؟ کانٹوں میں بھی ہے جنّتِ نظّارگی
کچھ نہ کچھ تو خاطرِ ذوقِ نظر کرتے چلیں

جا رہے ہیں اک "سراپائے غزل" کی بزم میں
آؤ یادِ حسرتؔ[1] آشفتہ سر کرتے چلیں

[1] شہنشاہِ تغزل مولانا حسرتؔ موہانی

غزل

جب سے دیکھا ہے انھیں اُس وقت سے دیوانہ ہوں
کاروبارِ عاشقی میں کس قدر فرزانہ ہوں

اک زمانہ سے اسیرِ کاکلِ جانانہ ہوں
پہلے بھی دیوانہ تھا اور آج بھی دیوانہ ہوں

دھوم ہے میری وفا کی رہروانِ شوق میں
خالقِ غم ہوں شہیدِ نرگسِ مستانہ ہوں

میری قسمت میں ہے ساقی کے لبوں کی چاشنی
میکدے میں یوں تو اک ٹوٹا ہوا پیمانہ ہوں

اب تو بھولے سے بھی یادِ مہوشاں آتی نہیں
جس میں کوئی بت نہیں موجود وہ بت خانہ ہوں

مر مٹوں گا لیکن آئیگا نہ لب پر حرفِ شوق
شمع کا سودائی ہوں خاکسترِ پروانہ ہوں

شاہکارِ حسنِ یزداں ہیں لب و رخسار و دست
اور میں ہر شاہکارِ حسن کا دیوانہ ہوں

رات دن ان کا تصور روز و شب انکا خیال
رونقِ شام و سحر سے کس قدر بیگانہ ہوں

مجھکو اظہرؔ تشنہ کامی کا نہیں کوئی گلہ
میں ہمیشہ سے امینِ جراَتِ رندانہ ہوں

غزل

جان و دل کی بھر سے ہم بازی لگا سکتے نہیں
اب نگاہِ ناز کے دھوکے میں آ سکتے نہیں
جان دے سکتے ہیں پر آنسو بہا سکتے نہیں
ہم زمانہ کو امینِ غم بنا سکتے نہیں
ان کو آتا ہی نہیں اپنی محبت کا یقیں
اور ہم دل چیر کر اُنکو دکھا سکتے نہیں
ہائے یہ مجبوریٔ خوباں کہ مرگِ عشق پر
اپنی بربادی کے ڈر سے مسکرا سکتے نہیں
ابتدائے آرزو کے ہائے وہ شام سحر
تم بھلا سکتے ہو لیکن ہم بھلا سکتے نہیں
دیدنی ہے بزم میں انکی پریشاں خاطری
ساتھ دے سکتے نہیں دامن چھڑا سکتے نہیں
ہو مبارک اُن کو تجدیدِ وفا کی آرزو
بار بار اُن کو مگر ہم آزما سکتے نہیں
اُن کی خاطر ہم نے غیروں سے بھی رکھی دوستی
اہلِ دل ان حادثوں سے بچ کے جا سکتے نہیں
اک زمانہ گوش بر آواز ہے اظہار تو کیا
بے اجازت داستانِ دل سنا سکتے نہیں

غزل

عمر بھر ان سے نہ ملنے کا اِرادہ کرنا
شیوۂ دوست نہیں دوست کو رسوا کرنا

قصۂ وامق و فرہاد کا چرچا کرنا
ان سے اس طرح بھی اظہارِ تمنا کرنا

ہر جفا، ہر ستم و جور گوارا کرنا
دیکھے دل انکو مناسب نہیں شکوہ کرنا

غیر کے کہنے پہ بھی رحم نہ آیا اُن کو
اب مناسب نہیں ملنے کا تقاضا کرنا

ایک ہی بار ہوا کرتا ہے پیمانِ وفا
ان سے اظہارِ محبت نہ دوبارا کرنا

داستان بلبلِ بیتاب کی ہو جائے بیاں
شکوہ کرنا مگر اس طرح سے شکوہ کرنا

مضحکہ خیز ہوئی جاتی ہے رسوائیِ دل
ان کو زیبا نہیں غیروں پہ بھروسہ کرنا

ان کو غیروں سے ہے ایک ربطِ خصوصی اظہر
اب مناسب نہیں تجدیدِ تمنا کرنا

غزل

التفاتِ یار اک خواب و خیالِ دل سہی
ہاں مگر اس کے سہارے کٹ رہی ہے زندگی

آسماں پر یوں تو تارے بھی ہیں اور مہتاب بھی
ہاں مگر سب سے سوا ہے تیرے غم کی روشنی

یوں تو تھی یلغار دل پر حادثاتِ دہر کی
اُن پہ مر مٹنے کی پھر بھی آرزو باقی رہی

ہے ازل سے تا ابد فرمانروائی عشق کی
حسن نے تو مفت میں پائی حیاتِ دائمی

آرزوئیں دل کی دل ہی میں رہیں خلوت نشیں
شوقِ بے حد نے سلامِ شوق کی مہلت نہ دی

گل بھی وارفتہ طبیعت دل بھی وارفتہ مزاج
کس قدر پھیلا ہوا ہے کاروبارِ عاشقی

ہر گھڑی ہر وقت رہتا ہے تمہارا انتظار
یہ بھی عالم انتہائے شوق کا ہے دیدنی

عہد و پیماں بھی غلط، ملنے کے وعدے بھی غلط
اب خدا کے واسطے چھیڑو نہ ذکرِ دوستی

ہر گلی کوچے میں اب ہوتا ہے اپنا تذکرہ
کتنی عبرت ناک ہے اظہر سزائے عاشقی

غم کو بھی ہم باعثِ آرامِ جاں سمجھا کئے
تا حدِ امکاں فریبِ دوستی کھایا کئے

دشمنوں کے ہاتھ پیغامِ وفا بھیجا کئے
وہ غریبِ عشق پر یوں بھی ستم ڈھایا کئے

اک وفا دشمن سے پیمانِ وفا باندھا کئے
اپنی بربادی کے خود ہی راستے پیدا کئے

عشقِ خود رفتہ اسیرِ زلفِ پیچاں ہی رہا
وہ جوازِ ظلم و جورِ ناروا ڈھونڈا کئے

انتہائے عشق ہو یا انتہائے رنج ہو
وہ ہر اک عالم میں اہلِ دل کو یاد آیا کئے

زندگی بھر ماہیٔ بے آب کی صورت جیئے
ابتدائے آرزو کی انتہا دیکھا کئے

وہ رقیبوں سے رہے ہنس ہنس کے محوِ گفتگو
اور ہم اک مسکراہٹ کیلئے ترسا کئے

وہ اب آئینگے، اب آنیوالے ہیں، اب آتے ہیں
دل کو ہم جھوٹے دلاسے دیکے بہلایا کئے

ایک لمحہ بھی نہ گزرا رنجِ فرقت کے بغیر
عمر بھر اپنی وفاؤں کا صلہ پایا کئے

وہ تھے بزمِ غیر تھی اور اہتمامِ ناؤ نوش
یہ سماں دیکھا نہ جاتا تھا مگر دیکھا کئے

وہ مٹاتے ہی رہے نقش و نگارِ آرزو
ہم اسے بھی وجہِ تسکینِ وفا سمجھا کئے

وعدہ کر کے بھی نہ آیا ان کو وعدہ کا لحاظ
اور ہم ان کی محبت کی قسم کھایا کئے

بجلیوں سے کانپ اٹھیں چمن کی ظلمتیں
اور ہم ہنس ہنس کے شاخِ آشیاں دیکھا کئے

دل نے آخر کر دیا مجبور اے اظہر ہمیں
لاکھ ہم اس کاروبارِ غم سے کترایا کئے

غزل

نامرادِ شوق بھی ہے شادکامِ انتظار
کس قدر میٹھا ہے دردِ ناتمامِ انتظار

صبحِ محشر کا کوئی مدِّ مقابل بھی تو ہو
اب سمجھ میں آگیا مفہومِ شامِ انتظار

ایک لمحہ کی بھی مہلت یادِ جاناں نے نہ دی
اللہ اللہ اس قدر نظم و نظامِ انتظار

اُن کے ہونٹوں کا تصور اُن کی آنکھوں کا خیال
دل ہے اور آٹھوں پہر ہے اہتمامِ انتظار

میں سمجھتا ہوں کہ مجھ کو مل گئی دادِ وفا
آپ کے دستِ حنائی میں ہے جامِ انتظار

حسن ہو یا عشق دونوں ہیں اسیرِ اضطراب
اللہ اللہ جلوۂ ماہِ تمامِ انتظار

جان و دل بھی اُن پہ صدقے دین و ایماں بھی نثار
کس سلیقہ سے ہوا ہے انتظامِ انتظار

آنکھ سے اشکوں کی یورش لب پہ آہوں کا ہجوم
یوں بھی ہوتا ہے مری جان اہتمامِ انتظار

زندگی کٹتی ہے شعروں کے سہارے آجکل
جانِ اظہرؔ بنتا جاتا ہے کلامِ انتظار

غزل

ہم کسی کے التفاتِ خاص کے قابل کہاں
اب نہ کوئی مہرباں ہے اور نہ کوئی ہم زباں

کس لئے ہے نذرِ آتش گلستاں کا گلستاں
ہم سے پوچھو ہم بتائیں گے حدودِ آشیاں

میری حالت پر نہ ہوں مغموم اربابِ جہاں
حسن کو مطلوب ہیں خود عشق کی رسوائیاں

دل کی کشتی نذرِ امواجِ حوادث ہی رہی
رنگ لاتی ہی رہیں ان کی ستم آرائیاں

شب کا سناٹا ہے میں ہوں اور یادِ یار ہے
قابلِ رشکِ دو عالم ہیں مری تنہائیاں

حادثاتِ عشق ہیں منجملہ آدابِ عشق
ہو رہے ہیں کس لئے مسرور خوبانِ جہاں

طبعِ آوارہ کو دھن ہے اہتمامِ شوق کی
ورنہ یہ دل اور اسیرِ آرزوئے مہوشاں

آہ کر سکتے نہیں آنسو بہا سکتے نہیں
کیا بتائیں عشقِ ناہنجار کی پابندیاں

میں نے اظہر زندگی میں اتنے کھائے ہیں فریب
ہوتا جاتا ہے انیسِ دل خلوصِ دشمناں

○

ہر گھڑی ہر وقت شغلِ برہمی کرتے رہے
زندگی بھر وہ رقیبوں کی خوشی کرتے رہے

دوستی کا نام لے کر دشمنی کرتے رہے
وہ خلوصِ عشق کی توہین ہی کرتے رہے

ہائے ان پروردگارانِ وفا کی زندگی
جو ہمیشہ اعتبارِ دوستی کرتے رہے

بے نتیجہ آرزوئیں بے اثر آہ و فغاں
زندگی کو مبتلائے مےکشی کرتے رہے

جیسے جیسے اضطرابِ آرزو بڑھتا رہا
ویسے ویسے وہ توجہ میں کمی کرتے رہے

اللہ اللہ اہتمامِ لالہ زارِ انتظار
زندگی بھر اُنکے غم سے دل لگی کرتے رہے

ہر نفس توہینِ غم تھا ہر گھڑی توہینِ عشق
ہم مگر اس پر بھی پاسِ عاشقی کرتے رہے

تم نے پیمانِ وفا توڑا بڑے دھوکے دیئے
اور ہم ہر بات کی تاویل ہی کرتے رہے

انکارِ اظہارِ کرم بھی تھا عجب انداز کا
نام بھی لیتے رہے بدنام بھی کرتے رہے

اس سے بڑھ کر ہوگا کیا اظہر ثبوتِ دوستی
مبتلائے غم رہے اُن کی خوشی کرتے رہے

حسن حمیدی

نام :- سید محمد حسن حمیدی ــــــــــ تخلص ۔ حسن (حمیدی)

جائے پیدائش :- پٹنہ (عظیم آباد) تاریخ پیدائش :- یکم فروری ۱۹۲۹ء

تعلیم :- ایم۔ اے

ادبی زندگی کا آغاز :- ۱۹۴۵ء (عظیم آباد) زمانۂ طالب علمی

ہجرت :- ۱۹۴۶ء (لاہور) ملازمت کا آغاز :- ۱۹۵۰ء

ویلفیئر آفیسر پاکستان پٹرولیم (۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۰ء)۔ سکریٹری ایوانِ صنعت و تجارت سکھر (۱۹۶۱ء تا حال)

ادبی مشاغل

نائب معتمد حلقۂ اربابِ ذوق منٹگمری (۱۹۵۱ء)، معتمدِ عمومی یونیورسٹی اورینٹل کالج اسٹوڈنٹس یونین لاہور (۱۹۵۲ء)۔ معتمدِ عمومی۔ ادبستان خیرپور (۱۹۵۷ء)۔ صدر بزم ادب سوئی گیس فیلڈ (۱۹۵۹ء)، معتمد مجلسِ ادب سکھر (۱۹۶۱ء تا حال)، رکن مرکزی مجلسِ عاملہ اِدارہ مصنفینِ پاکستان (مئی ۱۹۶۲ء)

تصانیف

۱۔ مجموعۂ کلام (زیرِ ترتیب)

۲۔ تحقیقی مقالات (۱) اردو ادب میں آزادی کا تصور

(۲) شاہ لطیف کا فن

(۳) ادبی اجارہ داری

الجزائر

جلوۂ حسنِ سحر دیکھ رہے ہیں کچھ لوگ
چشمِ ادراک میں احساس کی بینائی ہے
ہر قدم پر دلِ پُر خوں نے جلائے ہیں چراغ
جیسے گلیوں میں ستاروں کی برات آئی ہے
شاہراہوں پہ بھی بکھرے ہیں لہو کے غنچے
جیسے گلزار بنانے کی قسم کھائی ہے
حسن ہے قتل گہِ دیدہ وراں کی تخلیق
جب بھی آئی ہے صلیبوں پہ بہار آئی ہے
قید خانوں سے بھی آوازِ جرس آتی ہے
اہلِ دل کے لئے زنجیر بھی شہنائی ہے
ظلمتوں کو بھی ضیا بار کیا کرتے ہیں
شب کی توہین سرِ دار کیا کرتے ہیں

جنوبی افریقہ

کس نے مرتی ہوئی تہذیب کو للکارا ہے
آج آواز باندازِ دگر آتی ہے
سینۂ عزم پہ زخموں کے لہکتے یاغ
جام چھلکاتی ہوئی آج سحر آتی ہے
ماں کی سہمی ہوئی آغوش میں ممتا کی یہ لاش
آج تو موت بھی معصوم نظر آتی ہے

یہ در و بام پہ گلرنگ لہو کی کرنیں
تیری گلیوں میں شفق پھوٹ رہی ہو جیسے
کانپتے ہاتھوں میں تو خیر جگر کے ٹکڑے
دستِ ظلمت سے کماں چھوٹ رہی ہو جیسے
صبح پر رات کی یلغار رہے گی کب تک
دستِ مفلوج میں تلوار رہے گی کب تک

ہمسفرو ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!

چُپ ہو کیوں آج رفیقانِ سفر کچھ تو کہو

شب ہو تاریک تو اشکوں سے کرن پھوٹی ہے
لب ہوں خاموش تو زخموں کے دہن بولتے ہیں
عرصۂ حشر نہیں بزمِ رقیباں ہی تو ہے
بولنے والے سرِ دار و رسن بولتے ہیں

چُپ ہو کیوں آج رفیقانِ سفر کچھ تو کہو

کیوں ابھی راہِ محبت میں قدم تھم سے گئے
کیا کشش ہے کہ یہاں پائے جنوں جم سے گئے
حسنِ وحشت سے گئے دیدۂ پُرنم سے گئے
ایسے بھٹکے کہ شعورِ غمِ عالم سے گئے

چُپ ہو کیوں آج رفیقانِ سفر کچھ تو کہو

کاش تم محفلِ صاحب نظراں تک ہی چلو
آج زہرآب بلب بادہ کشاں تک ہی چلو

رسمِ دنیا ئے وفا اور ہی کچھ مانگتی ہے
گر سرِ دار نہیں کوئے بتاں تک ہی چلو

چپ ہو کیوں آج رفیقانِ سفر کچھ تو کہو
اھلِ دل نغمہ فشاں رقص کناں چلتے ہیں
مضطرب شعلہ بجاں برق وشاں چلتے ہیں
آبلے ہنستے ہیں اور کاہکشاں بنتی ہے
یہ جو مٹتے ہیں تو قدموں کے نشاں چلتے ہیں

ایک صدی پہلے ۔ ایک صدی بعد

(۱۸۵۷ء اور ۱۹۵۷ء)

جس وقت شبِ تار کی یلغار ہوئی تھی
کہتے ہیں کہ اک صبح نمودار ہوئی تھی

اغیار تو دربار کی تزئین بنے تھے
اپنوں سے ملاقات سرِ دار ہوئی تھی

یوں رسم رہِ عشق کی تبدیل ہوئی تھی
فریاد بھی للکار میں تحلیل ہوئی تھی

خون گشتہ جبینوں سے سحر جھانک رہی تھی
ظلمت کی نئے رنگ سے تذلیل ہوئی تھی

جو دار کے شایاں نہ تھے زنداں میں ملے تھے
رنگون کی وادی میں نئے پھول کھلے تھے

ٹیپو کا لہو بیچنے والوں کا کرم ہے
پردہ میں اُجالے کے وہی شامِ الم ہے

سہمی ہوئی آہوں کے جنازوں کو اُٹھائے
کہتے ہیں کہ ہاتھوں میں بہاروں کا عَلَم ہے
بولو کہ یہاں کوئی بھی خورسندِ نہیں ہے
اٹھو کہ درِ نورِ سحر بند نہیں ہے
ماحول کا یہ رنگ ہمیشہ نہ رہے گا
تاریخ تو افراد کی پابند نہیں ہے

فنکار

میرے احساس کا معیار نہ جانے کیا ہے
تیری یادوں کی شفق تیرے خیالوں کی دھنک
تیری آغوش میں سمٹی ہوئی دوشیزہ مہک
شبنمی حسن، یہ بھیگے ہوئے رخسار کے پھول
تیری معصوم نگاہی کے یہ مستانہ اصول

نور بردوش نگارانِ چمن کی یہ قطار
ہر روش اک روشِ کاہکشاں ہو جیسے
یہ فلک انجم و ناہید کا مئے خانۂ نور
ایک دانشکدۂ کم نظراں ہو جیسے
چند لمحات میں محبوس بہاروں کا طلسم
میری بے تاب نگاہی پہ گراں ہو جیسے

میرے احساس کا معیار نہ جانے کیا ہے

سوزِ دُنیا کا ہر اک دل کی خلش ہے دل میں
آگ لگتی ہے کہیں اور تپش ہے دل میں
سینۂ فکر پہ نادیدہ جفاؤں کے نقوش
جنتِ درد ہے زخموں کی روش ہے دل میں

میرے احساس کا معیار نہ جانے کیا ہے
مشعلِ رُخ ہو کہ یادوں کی روپہلی کرنیں
رات کیسی بھی ہو تاریک نظر آتی ہے
میری بے تاب نگاہی میری دیوانہ وشی
ہر نئے دور میں پیغامِ سحر لاتی ہے

زخمِ دل رونقِ گلزارِ سخن ہے شاید
اور احساسِ سکوں مدفنِ فن ہے شاید

زیرِ لب

ظلمتِ شب میں یہ نغموں کی فضا
جیسے گلیوں میں فقیروں کی صدا
ساز اُٹھاتے ہوئے جی ڈرتا ہے
فن بھی مرنے کی دعا کرتا ہے
جبر کی گود میں فن پلتا ہے
خندۂ گل سے چمن جلتا ہے
گم ہے زنجیر کی جھنکار میں لے
کوئی افسانۂ دل کیسے کہے
لب پہ جب گیت کوئی آتا ہے
خوف کے دشت میں کھو جاتا ہے
جلوہ گاہوں کا فسوں ٹوٹ گیا
سب سے دامانِ جنوں چھوٹ گیا
اب نہ سودا ہے نہ سودائی ہے

صرف کہنے کی یہ رسوائی ہے
ایسے ماحول میں کیوں یاد آئے

کس توقع پہ یہ تجدیدِ کرم
دل میں اب شورشِ ارماں تو نہیں

کن امیدوں پہ یہاں آئے ہو
زندگی آج غزل خواں تو نہیں

یہ جو بڑھتی ہوئی تاریکی ہے
سایۂ زلفِ پریشاں تو نہیں

یہ نہ پوچھو کسی دیوانے سے
سازِ لب چھین لیا ہے کس نے؟

تم کہو چشم کے پیمانوں میں
زہرِ غم گھول دیا ہے کس نے؟

تم کہ اِک سایۂ بے رنگ سی ہو
یہ کرم تم پہ کیا ہے کِس نے؟

مرقدِ دل میں نہ یوں دفن کرو
راز یہ رازِ محبت تو نہیں

اپنے آنچل کو کفن مت سمجھو
موت ہی منزلِ الفت تو نہیں
یہ اُداسی نہ رہے گی قائم
دستِ وحشت کی یہ فطرت تو نہیں
کامراں ہوگا جنوں بھی اک دن
عاشقی صرف ہزیمت تو نہیں
ہم بھی دیکھیں گے تبسّم کی سحر
جاوداں فطرتِ ظلمت تو نہیں

آج تزئینِ شبِ غم کے لئے
مشعلِ دیدۂ پُرنم ہی سہی
کچھ تو ظاہر ہوں جنوں کے آثار
جلوۂ کاکلِ برہم ہی سہی
آج ہے قتل گہِ عشق اداس
جب کوئی اور نہیں ہم ہی سہی

کون آیا ہے درِ احساس پر
کیسی یہ سرگوشیٔ مبہم سی ہے
نکہتِ زلفِ دوتا آئی نہ ہو
یادِ ایامِ وفا آئی نہ ہو
کوئے یاراں سے صبا آئی نہ ہو
صحنِ مقتل سے حنا آئی نہ ہو

شہر بدر

میں کہ اب اک برگِ آوارہ سا ہوں
دوشِ صحرا پر بھی اک بارِ گراں
میں سراپا خونِ بسمل کی زباں
جیسے تنہائی میں دل کی سسکیاں
جیسے ویرانے میں غنچے کی فغاں

میں کہ اب ہوں راندۂ نظمِ بہار
میں نے کی تھی سر اٹھانے کی خطا
اشکِ غم پلکوں پہ لانے کی خطا
شمعِ دل کی لو بڑھانے کی خطا
زورِ قاتل آزمانے کی خطا
میں کہ اب ہوں راندۂ نظمِ بہار

فکرِ نو

فکرِ نو آج تو کدھر آئی
پیش قدمی کو کہکشاں آئی
یہ کشش کا طلسم ٹوٹ گیا
نظمِ فطرت کی رازداں آئی

اک جہاں کی تلاش خوب مگر
اس جہاں کی تجھے خبر بھی ہے
زیست کا ارتقا تو لازم ہے
زیست ایک راہِ پر خطر بھی ہے

یہ خلا کا حسین شہزادہ
مسکراتے دلوں کی رعنائی
روئے زیبا کی جاوداں تمثیل
گنگناتے لبوں کی شہنائی

یہ کشاکش یہ نفرتوں کا جلال
یہ تباہی کے نت نئے دستور
یہ تجسس یہ ارتقا کی بات
جیسے بیوہ کی مانگ میں سیندور

خواب آلود لوریوں کا سہاگ
یہ مہکتے لبوں کا پیارا گیت
قلبِ شاعر کا بیکراں احساس
سازِ فطرت کی بے زباں سنگیت

ہر جبینِ وفا عرق آلود
خوف و دہشت سے زیست کا مذق
اشک بر دوش چشمِ جلوہ طلب
سہمی سہمی صباحتوں کی شفق

فکرِ نو! ہے تیرے تصرّف میں
بیکراں مستعارِ تابانی
پھر بھی دل ہے کہ سہما جاتا ہے
میرے احساس کی یہ نادانی

دودھیا آنچلوں میں کھلتے پھول
مسکرانے کا حق بھی رکھتے ہیں
نوجوانی کے تھرتھراتے ہونٹ
گنگنانے کا حق بھی رکھتے ہیں

زندگی امن سے عبارت ہے
امن آئینِ بزمِ فطرت ہے
ہم محبت کے گیت گاتے ہیں
زلیست پروردۂ محبت ہے

اب نئی صبح مسکرائے گی......!

زرعی اصلاحات سے متاثر ہو کر

میں کہ اک بے شعور سا اک دہقاں
کیا خبر مجھ کو کیا رموزِ حیات
قحط پرور نگار خانوں سے
مانگتا ہوں میں رزق کی خیرات

میں دعاؤں کی خانقاہوں سے
رحمتِ بے کراں کی آس لگائے
ایک آسودہ شام کی خاطر
غم کی پلکوں پہ کتنے دیپ جلائے

میری دُنیا گداگروں کا دیس
میرا دستِ عمل ہے ایک کشکول
میرا گھر ایک قصرِ خانہ بدوش
میرا ماحول قبر کا ماحول

میری بیوی میرے خلوص پہ طنز
میری بے چارگی کی لاش اُٹھائے
میرے بچّے غلاظتوں کے سپوت
کچّی قبروں میں رینگتے سائے

یہ جواں بہن منتظر سہاگ
نامکمل سی کے ادھورا راگ
میرے ماحول کے جہنم میں
سرد ہو جیسے زندگی کی آگ

میری ماں ہڈیوں کا تاج محل
پیٹ کی قبر میں سمٹتی جائے
جسمِ مریم پہ دھجیوں کا غلاف
آنکھ اٹھتی ہوئی بھی شرمائے

میں کہ اک بے شعور اک دہقاں   کیا خبر مجھ کو کیا رموزِ حیات
اک نئی فصل کے تصور میں   بھول بیٹھا میں تلخیِ حالات

میرے مقروض دست و بازو میں
رقص کرنے لگی توانائی!
کروٹیں لیں نئی امنگوں نے
جاگ اٹھی زندگی کی رعنائی

میرے جہد و عمل کی ہیبت سے   کھیت اگلنے لگے خزانوں کو
گنگنائے لبوں نے پیار کے گیت   سرخیاں مل گئیں فسانوں کو

جانے سرگوشیوں کی جنت میں
کتنی بے تابیوں کی بات چلی
کتنے خوابوں کے شاہراہوں پر
اک برات آئی اک برات چلی

جسمِ عریاں پہ آنچلوں کا خیال   کس قدر دل نشین ہوتا ہے

بھوکے بیٹوں کا خواب نانِ جویں ہائے کتنا حسین ہوتا ہے

میں کہ اک بے شعور اک دہقاں
کیا خبر مجھ کو کیا میری تقدیر!
میرے ہاتھوں میں پھر وہی کشکول
میرے خوابوں کی پھر وہی تعبیر

پھر وہی میری محنتوں کے خدا جن کے قبضے میں ہے، نظامِ حیات
پھر میری زندگی کفن بردوش پھر وہی میرے فاقہ کش لمحات

نوجواں آنسوؤں کی برکھائیں
بہہ گئے دھڑکنوں کے میخانے
پھر وہی بے کراں اُداسی ہے
سو گئے زندگی کے افسانے

میں کہ اک بے شعور اک دہقاں کیا خبر مجھ کو کیا رموزِ حیات
پھر بھی اتنا یقین ہے مجھ کو ہیں تغیر پذیر یہ لمحات

یہ شبِ غم گزر ہی جائے گی
یہ زمانہ بدل ہی جائے گا
اب نئی صبح مسکرائے گی
اب نیا وقت گنگنائے گا

رفیقو

(افریقی حریت پسندوں کے نام)

ڈر ہے یہی کہ مصلحتِ وقت کے طفیل
ذکرِ جنوں بھی حلقۂ محفل میں رہ نہ جائے
بولو! کہ دل کی بات کہیں دل میں رہ نہ جائے

زنداں میں کیا ہے آج تو مقتل بھی گونج اُٹھے
گم ہو کے نغمہ شورِ سلاسل میں رہ نہ جائے
قاتل کی آرزو دلِ قاتل میں رہ نہ جائے

شرمندگیِ فطرتِ قاتل کا واسطہ
اب کے برس تو دار و رسن ڈھونڈنے چلو
آؤ جمالِ صبحِ وطن ڈھونڈنے چلو

یہ مشقِ جور سینۂ بسمل پہ تا بہ کے
دستِ ستم سے اب تو کماں چھوٹنے لگی
جشنِ سحر مناؤ کہ پو پھوٹنے لگی

مرگِ احساس

گنگ نغموں کی زباں زیست کی نے مہر بلب
سرد ہے آتشِ دل ڈوب گئی نبضِ طرب

خوف سے جذبۂ و احساسِ وفا کا منہ فق
چپ ہیں یوں جیسے کہ آغوشِ مقابر میں ہوں سب

دل بھی دھڑکے تو رقیبوں کو خبر ہو جائے
کتنی پرہول ہے خاموشیِ تاریکیِ شب

تربتِ چشم ہے اشکوں کے جنازوں کو چھپائے
کس میں ہمت ہے کہ رستے ہوئے ناسور دکھائے

تیرگی قسمتِ صاحب نظراں ہے شاید
یا سیہ پوش ابھی صبح جواں ہے شاید

نطق و لب موردِ الزام یہ تنظیمِ سکوت!
دل کی آنکھوں سے ابھی اشک رواں ہے شاید

آئی اور آکے یہاں ظلمتِ شب تھم سی گئی
وقت کے پاؤں میں زنجیرِ گراں ہے شاید

ہاں! گوارا ہے ہمیں جرأتِ اظہار کی موت!
مرگِ احساسِ وفا ہے دلِ فنکار کی موت!

قہقہوں کا زہر

زخم کے شعلوں پہ دل کی تال پر
خندہ برلب رقص فرماتے رہے
خواب زارِ انبساطِ نو بہ نو
قافلے آتے رہے جاتے رہے
کوہسارِ آرزو کے سلسلے
کوئی تیشہ کارگر ہوتا نہیں
جلوہ گاہوں کے فسوں میں گم ہیں سب
ہم سفر بھی ہم سفر ہوتا نہیں
مصلحت کوشی کے اِس طوفان میں
ہر تمنّا ریت کی دیوار ہے
ہر توجہ، ہر تبسم، ہر ادا
زہر میں ڈوبی ہوئی تلوار ہے
آج پھر ہم زخمِ نو کے جام میں
قہقہوں کا زہر لے کر آ گئے

غزل

موہوم اُمیدوں سے بہل جاتے ہیں یوں بھی
معلوم نہ تھا لوگ بدل جاتے ہیں یوں بھی

آنکھوں میں لئے دید کی معصوم تمنّا
ہم آپ کے کوچے سے نکل جاتے ہیں یوں بھی

بے کار ہیں بدنام ترے حُسن کے شعلے
جلنا ہو مقدّر میں تو جل جاتے ہیں یوں بھی

خنداں ہیں عبث آپ مرے حالِ زبوں پر
گرتے ہوئے افراد سنبھل جاتے ہیں یوں بھی

بے وجہ تو رنگین نہیں مقتل کی فضائیں
غازہ ترے رخسار پہ مل جاتے ہیں یوں بھی

جو لمحے ہوں روشن دلِ پُرخوں کی ضیا سے
وہ لمحے اُجالے میں بدل جاتے ہیں یوں بھی

دیکھو نہ حسنؔ دل کو بھی مشکوک نظر سے
احباب کے تیور تو بدل جاتے ہیں یوں بھی

غزل

غموں کی تاریکیوں میں روشن ہیں آنسوؤں کے چراغ کب سے
سجاتے رہتے ہیں شامِ غم کو جگر کے تابندہ داغ کب سے

دبی دبی سرد سرد آہیں، تھکی تھکی اشکبار آنکھیں
ہماری گم گشتہ حسرتوں کا لگا رہی ہیں سراغ کب سے

چلے بھی آؤ کہ اُجڑے گلشن میں پھر سے دَورِ بہار آئے
شبابِ رفتہ کو رو رہے ہیں گُلوں کے ٹوٹے ایاغ کب سے

کسی کی دُنیا بسی ہوئی ہے، کسی کی محفل سجی ہوئی ہے
ہماری افسردہ انجمن کے بجھے ہوئے ہیں چراغ کب سے

نہ غنچے پھولے، نہ گُل کھلے اور نہ دَورِ فصلِ بہار آیا
یہ باغباں دے رہے ہیں ہم کو فریبِ تزئینِ باغ کب سے

تلاشِ منزل کی کرنے والو بچھا بھی دو دامنِ خودی سے
جہاں کو گمراہ کر رہے ہیں یہ عظمتوں کے چراغ کب سے

حسنؔ چلو اب بھی میکدے سے کہاں وہ محفل کہاں وہ ساقی
پڑے ہیں کس بے بسی میں دیکھو یہ ٹوٹے پھوٹے ایاغ کب سے

انجمن انجمن ہو چراغاں
اپنی دنیا میں لیکن ابھی تک
شہر کے شہر سونے پڑے ہیں
قریہ قریہ اندھیروں کا مسکن ہے
بستی بستی قیامت نشاں ہے
اے مری زندگی تو کہاں ہے
کون جانے اسی کشمکش میں
زخم دل کے مہکنے لگیں گے
خستہ و زخم خوردہ جبیں پر
نقش کہنہ دمکنے لگیں گے
یاس کی خوں اگلتی فضا میں
شمع احساس لو دے اٹھے گی
کون سی منزلوں کی طلب میں
جادہ پیما ترا کارواں ہے
اے مری زندگی تو کہاں ہے

"چشمۂ سیماب ریز"

اے جادۂ افلاک کے تابندہ ستارو!
صدیوں کے دھندلکوں میں بھٹکتی ہوئی مخلوق
صرف ایک ضیائے رخِ خورشید کی خاطر
کب سے سرِ آفاق نگاہوں کو جمائے
خاموش چٹانوں کی طرح دیکھ رہی ہے

ارماں ہیں کہ گہنائے ہوئے چاند کا چہرہ
آنکھیں ہیں کہ چڑھتے ہوئے دریا کی روانی
آہیں ہیں کہ توپوں سے برستے ہوئے گولے
اس عالمِ بے رنگ کی ہر ریت نئی ہے
مغموم امنگوں کے فسوں ساز شبستاں
درماندہ تمناؤں کی یخ بستہ چٹانیں!
اُمیّد و عزائم کی سیہ تاب عمارت!
برسوں سے تہہِ گنبدِ افلاک کھڑی ہے

اے جادۂ افلاک کے تابندہ ستارو!

آدم کی زمیں پر بھی کبھی غور کیا ہے؟
ڈالی ہیں کبھی پستیٔ انساں پہ نگاہیں؟
گہنائے ہوئے دیکھا ہے اُمید کا سورج!
ڈوبے ہوئے احساس کا نوحہ بھی سنا ہے!

یا دورِ خلاؤں میں بھٹکتے ہی رہے ہو،
افلاک کے سینے میں دھڑکتے ہی رہے ہو،
کیوں بڑھتے ہی جاتے ہیں سفاک اندھیرے!
کیوں صبح کے قندیل کی لَو ڈوب چلی ہے!
کیوں تیرہ و تاریک ہے ہر شام کا خیمہ!
کیوں زرد نگاہوں سے ہیں خوش رنگ سویرے!
کیوں خاک سی اُڑتی ہے سرِ وادیٔ صحرا!
کیوں جادۂ منزل پہ خموشی کے ہیں پہرے!
کیوں ختم نہیں ہوتے خزاؤں کے طلسمات!
اس سمت بہاروں کا گزر کیوں نہیں ہوتا!

اے جادۂ افلاک کے تابندہ ستارو!
صدیوں کے دھندلکوں میں بھٹکتی ہوئی مخلوق

سہہ سہہ کے لگاتار حوادث کے تھپیڑے
گمبھیر اندھیروں کی سسکتی ہوئی شب میں
خاموشیِ پیہم کا سبب جان گئی ہے

برسوں سے جمی تھیں سرِ آفاق نگاہیں
اُٹھتا ہے کوئی دم میں نقابِ رخِ فردا
اب رات کے دامن میں سمٹتے ہیں اندھیرے
یکلخت کسی صبح کی دیوی نے پکارا

درماندہ سیاہی کی کمر ٹوٹ رہی ہے
خوش رنگ اُجالوں کی سحر پھوٹ رہی ہے

منظرالوین

پورا نام :- عزیز احمد ایوبی ⁂ تخلص :- منظر (ایوبی)

والد کا نام :- علی احمد ایوبی (مرحوم) ⁂ جائے پیدائش :- بدایوں (روہیلکھنڈ) یو۔پی

سنِ پیدائش :- جنوری ۱۹۳۲ء ⁂ تعلیم :- ایم۔اے (اردو) بی۔کام

ادبی زندگی کا آغاز ۔ از ۱۹۴۸ء (بدایوں۔یو۔پی) زمانۂ طالب علمی۔

ہجرت :- ۱۹۵۰ء (کراچی)

سنٹرل سکریٹریٹ میں ملازمت کا آغاز ۱۹۵۰ء ⁂ مدیر معاون ماہنامہ "ہم قلم" ۶۱-۱۹۶۰ء

گورنمنٹ کالج شکارپور میں اردو لیکچرر کی حیثیت سے تبادلہ۔ ستمبر ۱۹۶۱ء

تصانیف

۱۔ مجموعۂ کلام (زیرِ طبع) ۲۔ تحقیقی مقالہ۔ "بیسویں صدی کی اردو شاعری میں نئے موضوعات"

۳۔ تحقیقی مقالہ "اردو شاعری میں موضوعات اور ہیئت کے تجربے"

۴۔ ڈرامے، فیچر، نغمے ریڈیو پاکستان کراچی

اے مری زندگی......

اے مری زندگی تو کہاں ہے

مدّتوں میرے دستِ طلب نے
کتنی راتوں کے گیسو سنوارے
کتنی صبحوں کی تیرہ جبیں پر
روشنی کے ستارے اُبھارے
ہجر کے لمحے پھر بھی نہ گزرے
وصل کا دور لیکن نہ آیا
وقت کا آج ایک ایک لمحہ
کس قدر تلخ کتنا گراں ہے

اے مری زندگی تو کہاں ہے

ذہن کی شاہراہوں پہ کب سے
گمرہی کے دیئے جل رہے ہیں
کتنی مغموم امنگوں کے سورج
درد کے روپ میں ڈھل رہے ہیں

کتنے طوفانِ رنج و حوادث
دل کی آغوش میں پل رہے ہیں
ہر تمنّا کی لَو بجھ گئی ہے
ہر نفس آج شعلہ بہ جاں ہے
اے مری زندگی تو کہاں ہے
چلچلاتی ہوئی دھوپ غم کی
دین و دل کو جھلسا رہی ہے
اَن گِنت آرزوؤں کی شدّت
آگ سینے کی بھڑکا رہی ہے
جل رہے ہیں شبستانِ حسرت
راکھ ہونے کو ہے دل کی بستی
آگ بجھنے سے پہلے کا عالم
ہر طرف بس دھواں ہی دھواں ہے
اے مری زندگی تو کہاں ہے
گلستاں گلستاں پھول مہکیں
صحرا صحرا چلے بادِ باراں
بزم در بزم ہو دورِ ساغر

اردو شاعری پر نئے موضوعات کی تلاش کا اثر

بیسویں صدی کی اردو شاعری پر بحیثیت مجموعی نئے موضوعات کی تلاش کا جو اثر ہوا ہے اس مقالے میں اس پر روشنی ڈالی جائے گی۔ یہ اثر اردو شاعری پر کئی صورتوں میں پڑا۔ نئے موضوعات کی تلاش نے اردو شاعری کو اظہار و بیان کے پیمانوں میں تبدیلی کرنے پر مجبور کیا۔ جس کے نتیجے میں ہیئت، اسلوب، طرزِ ادا، اور اندازِ بیان میں مختلف تجربے کیے گئے۔ شاعری کی بعض پرانی روایات کو دوبارہ زندہ کیا گیا اور بعض نئی روایات قائم کی گئیں۔ مختلف ملکی اور غیر ملکی ادبی رجحانوں اور تحریکوں سے اردو شاعری کا رشتہ جوڑا گیا۔ بیسویں صدی کی اردو شاعری میں یہ تبدیلیاں، یہ تجربے، یہ ایجادیں، یہ رجحانات اور یہ تحریکیں براہِ راست نئے موضوعات کی تلاش کے نتیجہ کے طور پر ہی ظہور پذیر ہوئیں۔

یہ مسلّمہ امر ہے کہ موضوع اور ہیئت دونوں میں تبدیلی تقریباً ساتھ ساتھ ہوتی ہے۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے تو زیادہ صحیح ہوگا کہ نیا موضوع اپنے ساتھ اظہار و بیان کا نیا پیمانہ بھی لاتا ہے۔ موضوع کا تعلق شاعر، ادیب یا فنکار کی سماجی زندگی سے ہوتا ہے لیکن شاعر یا فنکار کسی خیال، کسی واقعہ، کسی کیفیت، کسی واردات غرض زندگی کے کسی پہلو، کسی رخ، یا کسی سمت کی تصویر کشی کرنے کے لئے فنی لوازم کا سہارا لیتا ہے اور ان کے انتخاب اور استعمال کا تعلق اس کی اپنی شخصیت سے ہوتا ہے۔ یہی شخصیت کسی ادبی تخلیق میں جمالیاتی اقدار پیدا کرتی ہے۔ اس میں ہیئت، اسلوب، طرزِ ادا، اندازِ بیان سب ہی کچھ شامل ہے۔ موضوع اور ان تمام چیزوں میں ہم آہنگی، توازن اور ترتیب کا لحاظ رکھنا ایک اچھے

شاعر یا فنکار کے لئے ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو ایک شاعر کو دوسرے پر اور ایک فنکار کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔

غرض شاعری ہو یا مصوری، رقص ہو یا موسیقی، تعمیر ہو یا خطاطی، فنونِ لطیفہ کا کوئی بھی شعبہ کیوں نہ ہو، موضوع، مواد، ہیئت اور اسلوب میں ہم آہنگی، توازن اور تناسب کا لحاظ رکھنا بہت ضروری ہے۔ پھر شاعری کو دوسرے فنونِ لطیفہ پر یوں بھی فوقیت حاصل ہے۔ شاعری کا براہِ راست تعلق انسانی جذبات و حسیات سے ہے۔ جن کا اظہار الفاظ کی شکل میں ہوتا ہے اور جو غیر مادی ہوتے ہوئے بھی مادی پیمانوں کے تابع ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے شاعر کا کام مصور، بت تراش، موسیقار اور معمار کے مقابلے میں بہت زیادہ مشکل اور اہم ہے۔ شاعر اپنے جذبات و احساسات اور تجربات و مشاہدات کی تصویریں الفاظ کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ ان لفظوں کی ترتیب و تنظیم وہ ایسے خارجی ڈھانچوں میں کرتا ہے جو اس کے مافی الضمیر کو کافی مؤثر، حسین اور دلکش بنا دے۔ اور یہ کام بڑی جان جوکھوں کا ہے۔ اسی لئے شاعری کو ایک مشکل فن کہا گیا ہے۔ اس کے باوجود شاعری ہر ملک، ہر دور، ہر زمانے اور ہر عہد میں دوسرے فنونِ لطیفہ کے مقابلے میں زیادہ ہر دلعزیز، زیادہ دلچسپ اور زیادہ مقبول رہی۔

اردو شاعری کا بھی یہی حال ہے۔ یہ بھی اپنی ابتدا سے لے کر آج تک قبولِ عام حاصل کرتی رہی ہے۔ اور ہر دور اور ہر زمانے میں لوگوں نے اس سے کام لیا ہے۔ یہ کئی منزلوں سے گذری ہے۔ کتنی ہی صاف اور پُرپیچ راہوں سے گذر کر اس کا قافلہ موجودہ منزل تک پہنچا ہے۔ یہ اپنی آغوش میں کئی صدیاں، کئی ادوار، اور کئی زمانے چھپائے ہوئے ہے، جن کا سراغ لگانے سے ہمیں اردو شاعری کے مختلف مدارج کا پتہ چلتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اپنے مختلف ادوار میں اردو شاعری بھی دوسرے فنون کی طرح اپنے موضوعات، مواد، ہیئت اور اسلوب میں یکساں نہیں رہی ہے بلکہ خارجی حالات و

واقعات اور سیاسی و معاشی انقلابات نے جہاں شاعروں اور فنکاروں کو چیزوں کو نئے انداز سے دیکھنے، نئے طریقے سے سوچنے، غور کرنے اور پرکھنے کا شعور اور احساس پیدا کیا ہے، وہیں شاعروں یا فنکاروں کو یہ بات بھی سمجھائی ہے کہ وہ نئی چیزوں اور نئی باتوں کو نئے انداز، نئے طریقے اور نئے زاویہ سے، نئے سانچوں اور نئے ڈھانچوں میں پیش کریں۔ تاکہ ان کے خیال اور بیان دونوں میں ایک ہم آہنگی ہو۔

شروع شروع میں اردو شاعری میں ان تمام باتوں کا لحاظ بہت کم رکھا جاتا تھا۔ اردو شاعروں میں یہ نیا احساس، نیا جذبہ اور نیا شعور واضح اور محسوس طور پر بیسویں صدی میں نئے موضوعات کی تلاش کے ذریعہ پیدا ہوا ہے۔ اور اسی زمانے میں اُس نے ترقی حاصل کی ہے۔

قدیم اردو شاعری کے موضوعات محدود تھے۔ کیونکہ صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے اردو شاعری فارسی کی مقلد رہی۔ اسی لئے اس میں فارسی کی تمام اصناف اور شعری روایات دخل پا گئیں۔ ان روایات میں شاعری کی ایک روایت "موضوعات" بھی تھی۔ ان موضوعات میں حسن و عشق، مدح و ذم و ہجو، مذہب و عشق اور منظر نگاری کا بڑا چرچا تھا۔ ان موضوعات کی تجدید کے اسباب سیاسی و معاشی ہی تھے۔ اس وقت ہندوستان اور ایران دونوں ممالک تقریباً یکساں خارجی حالات و واقعات سے دوچار تھے۔ جاگیردارانہ نظام تھا۔ ادب اور شاعری ایک مخصوص طبقہ کی میراث اور اونچے طبقہ کی زندگی کی عکاس تھی۔ سماج کے دوسرے طبقوں کی زندگی شاعروں کے لئے باعث کشش نہ تھی۔

ولی، سراج، آبرو، حاتم، میر، سودا، درد، شاہ نصیر، ناسخ، آتش، مومن، غالب اور ذوق وغیرہ کی غزلوں میں اسی قسم کے ماحول اور معاشرے کی تصویریں ملتی ہیں۔ غزل اپنی ہیئت کے اعتبار سے حسن و عشق اور اس قسم کے متعلقات کی عکاسی کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ لہٰذا ولی سے لے کر غالب تک غزل کا بنیادی موضوع یہی نظر آتا ہے

ان شاعروں میں سے اگر کسی شاعر نے دوسری اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے تو اس کے اسباب "حسن و عشق" کے علاوہ سماجی زندگی کے نئے موضوعات ہو سکتے ہیں ۔ ان شاعروں نے اپنے موضوعات کو غزل کے سانچے میں ڈھالنے کے بجائے مخمس، رباعی، مثنوی، اور ترجیع بند کی صورت میں پیش کیا۔ کیونکہ وہ اپنے خیالات و جذبات کو زیادہ حسین، زیادہ دلکش اور زیادہ مؤثر بنانا چاہتے تھے۔

اس پورے عرصہ میں صرف ایک شاعر نظیر اکبر آبادی نظر آتے ہیں جو اپنے موضوعات عام زندگی سے حاصل کرتے ہیں اور ان کی مناسبت سے نئے انداز اور طریقے استعمال کرتے ہیں۔ اس کا سبب یہ تھا کہ نظیر سے پہلے اردو شاعری صرف اونچے طبقے کی زندگی کی عکاس تھی، نظیر نے اس کا تعلق عوام سے قائم کیا۔ نظیر کی ان کوششوں کا رنگ کافی دیر کے بعد رنگ لایا۔ قدیم شاعروں میں نظیر کو اس لحاظ سے سب پر فوقیت حاصل ہے کہ انھوں نے نئے موضوعات کی تلاش اور ان کے اظہار کے لئے بعض اہم خارجی ڈھانچوں کو اپنایا اور اپنے موضوعات کی مناسبت سے ان میں تغیر و تبدل کیا۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی نے ہندوستان کا نقشہ ہی پلٹ دیا۔ ایک جاگیردارانہ نظام کی جگہ دوسرے جاگیردارانہ نظام نے لے لی۔ ہندوستان کی سیاسی و سماجی اور معاشی و معاشرتی زندگی یکسر بدل گئی۔ زندگی کے ہر شعبہ میں ایک عظیم تغیر رونما ہوا۔ ہندوستان کی تہذیب و تمدن، کلچر، معاشرت اور سیاست کی تبدیلیوں نے علوم و فنون کو بھی متاثر کیا۔ نئے حالات و واقعات نے زندگی کے نئے نئے مسائل پیدا کر دیئے، ان مسائل کو حل کرنے کے لئے اردو شعر و ادب نے بھی حصہ لیا۔ جن شاعروں میں زندگی کے نئے تقاضوں اور وقت کے نئے مسئلوں کو حل کرنے کی سکت نہیں تھی، خاموش ہو گئے۔ بعض کی آنکھیں نئے افق کی روشنی سے چکاچوند ہو گئیں۔ انھوں نے نئی زندگی اور اس کے نئے نظام کو خوش آمدید کہنے کے بجائے پرانی روایات کو سینے سے چمٹائے رکھنا چاہا۔

غزل

لوگ کس لئے آخر بے رخی سے ملتے ہیں
کوئی ہم سے ملتا ہے، ہم کسی سے ملتے ہیں

کشتۂ غمِ دوراں کب کسی سے ملتے ہیں
آپ ہی تک آتے ہیں آپ ہی سے ملتے ہیں

ارتباطِ باہم کو عمر ہو گئی ۔ لیکن
جب کبھی وہ ملتے ہیں اجنبی سے ملتے ہیں

چاکِ جیب و دامن پر طنز ہر نظر میں ہے
ہم سے وہ بظاہر تو سادگی سے ملتے ہیں

سایۂ سلاسل ہو، دار ہو کہ زنداں ہو
زندگی کے دیوانے زندگی سے ملتے ہیں

بزمِ جام و بادہ میں سوچنے کے کچھ پہلو
آج بادہ خواروں کی تشنگی سے ملتے ہیں

رہروانِ راہِ غم نا امید مت ہونا
سلسلے اندھیروں کے روشنی سے ملتے ہیں

سوچیے تو اے منظرؔ دردِ زیست کے رشتے
کچھ نہ کچھ عنایاتِ خسروی سے ملتے ہیں

یقینِ فردا

صحنِ گلشن میں ابھی تک ہیں خزاں کے پہرے
ہر طرف پھول کی لاشوں کے لگے ہیں انبار
جیسے صدیوں کی غلامی سے رہائی کے لئے
ایک اک گام پہ بنتے ہیں شہیدوں کے مزار

زخم آلودہ جبینوں سے ٹپکتا ہوا خوں
غنچہ و گل کی نزاکت کا پتہ دیتا ہے
دیدۂ و دل کی جھلستی ہوئی شاخوں کا دھواں
آرزوؤں کی شہادت کا پتہ دیتا ہے

جب بھی چھڑتا ہے گلستاں میں کہیں ذکرِ بہار
یاد آتی ہے مجھے سادگیِ سرو و سمن
دیکھ کر دامنِ گلچیں پہ لہو کی چھینٹیں
اور ابھر آتی ہے سینے میں بہاروں کی لگن

دوستو، راہگذاروں پہ اندھیروں کا ہجوم
آج ڈستا ہے اجالوں کو تو ڈس جانے دو
نرم شاخوں کے وہ اس پار افق پر کب سے
تلملاتی ہیں بہاروں کی شعاعیں دیکھو

سکوتِ دشت بھی ٹوٹا، چمن میں گُل بھی کھِلے
ہمارے ہونٹ ہیں اب تک مگر سِلے کے سِلے
کہاں کے جور و ستم، اور کہاں کے شکوے گلے
کہ جب بہار میں پھولوں کے پیرہن نہ سِلے
بڑے خلوص سے آئے، بڑے ادب سے ملے
ہماری بات پہ لیکن کسی کے لب نہ ہلے
یہی ہیں کیا مری اگلی محبتوں کے صِلے
کہ ایک بار جو بچھڑے تو پھر کبھی نہ مِلے
جمالِ دوست کی نیرنگیاں بجا لیکن
خیالِ جرأتِ دار و رسن کی داد مِلے
کسی کا نقش کچھ اس طرح ذہن پر اُبھرا
کہ جیسے دامنِ صحرا میں کوئی پھول کھِلے
وہی جو مدّتوں سائے کی طرح ساتھ رہے
تمہاری بزم میں پہنچے تو اجنبی سے ملے
بھرے چمن میں نہیں کوئی آشنائے بہار
نسیمِ صبح کے جھونکوں کی داد کس سے ملے
ترا شعار ہے منظرؔ فروغِ نقدِ حیات
جہاں میں کوئی ترا قدر داں ملے نہ ملے

غزل

فصلِ گُل بھی آتی ہے جام بھی کھنکتے ہیں
میری آرزوؤں کے باغ کب مہکتے ہیں

جھلملانے لگتی ہیں تیری یاد کی راہیں
جب کبھی خیالوں کے قافلے بھٹکتے ہیں

باغ دیدہ و دل کا خشک ہو گیا لیکن
پھول تیری یادوں کے آج بھی مہکتے ہیں

بارہا چلیں غم کی تیز آندھیاں لیکن
اب بھی دل کی راہوں پر کچھ دیئے چمکتے ہیں

کون چھو کے گذرا ہے سرحدِ تخیل کو
کس کی نکہتِ پا سے بام و در مہکتے ہیں

دل کے آئینے میں یہ کس کا عکس پڑتا ہے
کس کی یاد کے شعلے ذہن پر لپکتے ہیں

کتنے لالہ و گل کا سینہ چاک ہوتا ہے
تب کہیں بہاروں کے پیرہن مہکتے ہیں

منظرؔ اس خموشی کا کچھ تو ہے سبب آخر
کون سے تصور میں ذہن و دل بھٹکتے ہیں

لیکن کچھ شاعر ایسے بھی تھے جنہوں نے وقت کی نبض کو پہچانا۔ نئے حالات و واقعات سے سمجھوتہ کرکے زندگی کے نئے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ سرسید، حالی، شبلی اور آزاد نے اردو شعروادب میں اصلاحی اور افادی تحریک کا آغاز کیا۔ یہ تحریک اردو ادب کی مختلف اصناف میں تبدیلیوں کا سبب بنی۔ اس نے اردو شاعری میں ایک عظیم انقلاب برپا کیا۔ اپنے دور کی سیاسی و سماجی زندگی، اقتصادی و معاشی حالات کا جائزہ لیا اور ان کی روشنی میں اپنے اندازِ فکر میں تبدیلی کی۔ مغربی زبانوں سے استفادہ کیا۔ ان کی بعض اہم خصوصیات کو اپنایا۔ زندگی اور شاعری کے درمیانی رشتہ کو مضبوط و مستحکم کیا۔ بعض کلاسکی روایات کو خیرباد کہا اور بعض نئی روایات کو جنم دیا۔ اصنافِ شاعری میں اصلاح کی گئی۔ ان کو حالات کے تابع لایا گیا۔ بعض پرانی روایات کو دوبارہ زندگی بخشی گئی۔ انجمن پنجاب کی تشکیل عمل میں آئی۔ مناظرِ فطرت اور مظاہرِ قدرت کی تصویرکشی کی گئی۔ شاعری کو نیچر کے قریب لایا گیا۔ خیالات کے تنوع اور احساسات کی وسعت کے لحاظ سے غزل کے بجائے نظم کی طرف زیادہ توجہ دی گئی اور نظم کے بعض پرانے پیمانوں میں نئے موضوع اور مواد کی مناسبت سے تبدیلیاں کی گئیں۔ خیال اور بیان میں ہم آہنگی قائم کی گئی اور شاعری کا مقصد معاشرے کی اصلاح قرار پایا۔ اس طرح واقعہ پسندی، حقیقت نگاری اور سادگی کو فروغ حاصل ہوا۔ اور یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ اس وقت اردو شعرا نئی باتوں کو نئے طریقے اور نئے انداز ہی میں پیش کرنا چاہتے تھے۔ وہ نئے موضوعات کو نئے خارجی ڈھانچوں میں پیش کرنے کے متمنی تھے۔ تاکہ ان کا اصلاحی اور افادی مقصد بحسن و خوبی پورا ہوسکے۔

قومی اور وطنی، سیاسی اور سماجی شعور کی بیداری بھی اسی زمانے میں ہوئی۔ نشاۃِ ثانیہ کا احساس بھی اسی دور میں ابھرا۔ لیکن بیسویں صدی میں اس کو بہت زیادہ فروغ حاصل ہوا خاص طور پر اس وقت جب ہندوستان کے سیاسی و سماجی، اقتصادی و [illegible]

حالات بہت زیادہ پیچیدہ ہو گئے۔ اس میں بیرونی حالات نے بھی کافی کام کیا۔ ٹرکی کا انقلاب، ایران کا قومی فروغ، چین کی بغاوت اور جاپان کے مقابلے میں روس کی شکست نے دنیا کے ایک وسیع علاقہ سے شہنشاہیت اور استبداد کا خاتمہ کر کے جمہوریت کا آغاز کیا۔ ادھر ہندوستان میں بھی کانگریس اور مسلم لیگ کی جماعتوں نے سیاسی سرگرمیاں شروع کیں۔ اس کے بعد جو پے بہ پے حالات و واقعات ہندوستان میں رونما ہوئے انہوں نے بھی اردو شاعری کو قومیت اور وطنیت سے متعلق گوناگوں موضوعات دیئے۔ جنگِ عظیم میں انگریزوں کے ہندوستانیوں سے وعدے اور جنگ کے بعد ان وعدوں کے ایفا سے انحراف، رولٹ ایکٹ، جلیان والا باغ اور قتل امرتسر، مارشل لا، ہوم رول کی تحریک، روس کا انقلاب، سول نافرمانی، ترک موالات کی تحریک، خلافت کی تحریک، مزدوروں کا اتحاد، ٹریڈ یونین ایکٹ، کمیونسٹ پارٹی کی تشکیل وغیرہ سے اردو شاعروں کو نئے نئے موضوعات ملے اور انہوں نے تقریباً ہر واقعہ اور ہر حادثہ پر طبع آزمائی کی۔ قومیت اور وطنیت کے ان موضوعات پر حالیؔ آزادؔ اور شبلیؔ نے کافی نظمیں لکھیں۔ "شکوہ ہند" "چپ کی داد" "حب وطن" "شہر آشوب" "جنگِ یورپ اور ہندوستان" جیسی نظمیں اس سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

حالیؔ، شبلیؔ اور آزادؔ نے اپنے بعد اقبالؔ، جوشؔ، چکبستؔ، سرور جہان آبادی سلیم، نظم طباطبائی، حسرتؔ، شادؔ، عزیزؔ اور ثاقبؔ لکھنوی کو چھوڑا۔ ان شاعروں نے قوم پسندی اور وطن پرستی، ہندو مسلم اتحاد، غلامی سے نجات حاصل کرنے، آزادیٔ وطن اور حریت و انقلاب کے موضوعات کو اپنا کر دامنِ شاعری میں بہت بڑا اضافہ کیا۔ اس زمانے میں بھی ان موضوعات پر نظموں کا سرمایہ زیادہ ملتا ہے۔ لیکن ان نئے شاعروں نے غزلوں میں بھی وطن پرستی اور قوم پسندی کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ بلکہ ان میں سے بعض نے جن میں اقبالؔ، جوشؔ، حسرتؔ اور شادؔ خاص طور پر

قابلِ ذکر ہیں۔ اپنی غزلوں میں پہلی مرتبہ شعوری طور سیاست و انقلاب کا نعرہ بلند کیا ہے گویا جنگِ عظیم تک تقریباً شاعری کا اصلاحی دور چلتا ہے۔ اس کے بعد قومی اور وطنی دور کا فروغ ہوتا ہے اور سیاسی و انقلابی شاعری اپنے شباب پر نظر آنے لگتی ہے اقبالؔ "ہمالیہ" "نیا شوالا" کے بعد "خضرِ راہ" لکھتے ہیں۔ سرورؔ جہان آبادی "کوئل" اور چکبستؔ "خاکِ وطن" اور "یادِ وطن"! سلیمؔ، نظمؔ اور جوشؔ کی ہلکی پھلکی نظمیں سامنے آتی ہیں۔ یہ شعراء اپنے موضوعات کو شعری جامہ پہنانے کے لئے نظموں کی ساخت اور اس کے ڈھانچے میں تبدیلیاں بھی کرتے ہیں اور جب نظم کی خارجی شکل کو اپنے خیال کے مطابق نہیں پاتے تو اس میں موضوع کے لحاظ سے بندوں کو گھٹا بڑھا کر الفاظ کے الٹ پھیر سے مناسب اور موزوں تبدیلی کر لیتے ہیں۔ عظمت اللہ خاں ہندی پنگل، ہندی لفظوں اور ہندی شاعری کی بعض عمدہ خصوصیات کے ذریعہ اردو شاعری کے موضوعات، اسلوب، ہئیت اور اندازِ بیان میں ایک اچھوتا پن، ایک وسعت، اور ایک ہمہ گیری پیدا کرتے ہیں۔ ظفر علی خاں ہر واقعہ کو اپنی شاعری کا موضوع بنا کر دامنِ شعر میں وسعت پیدا کرتے ہیں۔ اکبرؔ مغرب کی اندھی تقلید پر طنز کر کے اصلاح اور تبلیغ کے موضوع بناتے ہیں۔ حسرتؔ، شادؔ اور دیگر غزل گو شعراء غزل کی زبان، اظہارِ بیان اور طرزِ ادا میں موضوع کی مناسبت سے تبدیلیاں کرتے ہیں۔

غرض نظم ہو یا غزل دونوں میں اپنے زمانے، اپنے ماحول اور اپنے معاشرے کی تصویر کشی بھی کی گئی ہے اور اس دور کا خاکہ بھی اڑایا گیا ہے۔ یہ سب کچھ نتیجہ ہے اردو شاعروں کا نئے موضوعات کو زندگی سے براہِ راست حاصل کرنے کا۔

ان موضوعات کے علاوہ نئے موضوعات کی تلاش کا اثر اردو شاعری پر یہ بھی ہوا کہ اس میں رومان پسند شاعروں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہوا جس نے شاعری کے بنیادی اور خصوصی موضوع "حسن و عشق" کو واقعیت، حقیقت اور صداقت کے قریب

کردیا۔ اختر شیرانی، جوشؔ، افسرؔ، احسانؔ، راشدؔ، میراجیؔ، خالدؔ، اختر الایمان اور مخمور جالندھری اسی حلقے میں شامل ہیں۔ ان کی دنیائے محبت آسمانی فضا نہیں، بلکہ زمین اور اس پر بسنے والی مخلوق ہے۔

اردو شاعری میں عشقیہ حقیقت نگاری کی یہ پہلی باضابطہ اور شعوری کوشش تھی اس لحاظ سے رومان پسند شاعروں کے موضوعاتِ شعری بڑی حد تک اچھوتے اور نئے تھے۔ جن کو پیش کرنے کے لئے انھیں شاعری کے نئے خارجی ڈھانچوں کی ضرورت پیش آئی۔ اظہار و بیان کی مروجہ خارجی شکلیں، ان کے وسیع خیالات، عمیق جذبات، حسین کیفیات اور شدید احساسات کی متحمل نہیں ہوسکتی تھیں۔ پرانے تشبیہ و استعارے، اشارے اور کنائے، صنائع اور بدائع ان کے کلام میں اشاریت اور رمزیت پیدا نہیں کرسکتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے اس کے استعمال کو غیر ضروری سمجھا۔ ان کے اسی جذبے نے انھیں شاعری کی ہر پرانی روایت سے بغاوت پر اکسایا۔ جس کے نتیجہ میں انھوں نے نئی زبان، نئی طرزِ ادا، نیا اندازِ بیان، نیا اسلوب اور نئی ہیئت کے تجربے کئے اور بعض نئی روایتوں کو قائم کیا۔ اور یہ سب کام انھوں نے بعض انگریزی نظموں کے ترجمے کرکے، انگریزی شاعری کی بعض اصناف کو اپنا کر، ہندی شاعری کی بعض اہم خصوصیتوں کو مستعار لے کر، ہندی کے بعض مترنم الفاظ اور بحروں میں طبع آزمائی کرکے اور خود اردو شاعری میں عشقیہ حقیقت و واقعیت نگاری کی داغ بیل ڈال کر کیا۔

علاوہ ازیں نئے موضوعات کی تلاش کا اثر اردو شاعری پر یہ بھی ہوا کہ اس کے ذریعہ اردو کے بعض جدید شاعروں نے جہاں اپنی شاعری کو نفسیاتی الجھنوں، جنسی کیفیتوں، شعور، لاشعور اور تحت الشعور کے اظہار کی ایک صورت آزاد نظم اور نظم معرا کا آغاز کیا۔ یہ اصناف اردو شاعری کے لئے بالکل اجنبی اور نئی تو نہیں تھی

جاسکتیں۔ کیونکہ میراجی، راشد، خالد اور اختر الایمان سے بہت پہلے مولانا شرر اور اسمٰعیل اس کی ابتدا کر چکے تھے۔ البتہ اوّل الذکر شاعروں کے تجربات چونکہ وقت کے عین مطابق تھے۔ لہٰذا کامیابی کا سہرا انھیں کے سر باندھا گیا۔ رہی یہ بات کہ یہ شعراء اگر اپنے نئے موضوعات کو نظم کے پرانے اور مروجہ خارجی سانچوں میں ڈھالتے تو کسی حد تک کامیاب رہتے۔ ایک علیحدہ بحث ہے۔ ہمیں اس سے سروکار نہیں۔ ہمیں صرف اتنا کہنا ہے کہ یہ نئے موضوعات کی تلاش ہی کا اثر ہے کہ یہ شعراء اردو نظم کی ہیئت، اسلوب اور پیرایۂ اظہار و بیان میں تجربے اور جدّت کرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔

۱۹۳۵ء کے بعد اردو شاعری اشتراکی رجحان سے روشناس ہوتی ہے۔ شعر و ادب کو سماجی زندگی کا ایک شعبہ قرار دیا جاتا ہے۔ زندگی کو جدلیاتی اور مادی حکومت بتایا جاتا ہے۔ اس طرح شاعری بھی ایک جدلیاتی حرکت بن جاتی ہے۔ شاعر کے جذبات اور احساسات کو خارجی حالات و واقعات کا پروردہ ثابت کیا جاتا ہے۔ شاعر کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنا رشتہ تمام بنی نوع انسان سے جوڑے۔ جغرافیائی اور سیاسی حدود کو توڑ کر تمام دنیا کے انسانوں سے محبت کرنا سیکھے۔ وہ دنیا میں ایک غیر طبقاتی نظام اور صحت مند معاشرے کی تشکیل کرنے کے لیے اپنی شاعری کو ایک آلہ کی حیثیت سے استعمال کرے۔ یہ رجحان اردو شاعری میں نیا نہیں۔ اس قسم کی جھلکیاں اردو شاعری میں پہلے بھی ملتی ہیں۔ البتہ سیاسی، سماجی، اقتصادی و معاشی حالات نے ۱۹۳۵ء کے بعد اس رجحان کو تحریک کی حیثیت بخشی۔ جوشؔ۔ مجازؔ۔ سردارؔ۔ ساحرؔ۔ ندیمؔ۔ مخدومؔ۔ کیفیؔ۔ جذبیؔ۔ فیضؔ۔ اخترؔ انصاری۔ حامد عزیز مدنی اور ابن انشاء وغیرہ نے اس تحریک کو آگے بڑھانے میں بڑی کوششیں کیں۔ ان تمام شاعروں نے شاعری میں افادیت، خارجیت، مقصدیت، حقیقت، صداقت، اور واقعیت کی نئی روایات قائم کیں۔ نئے موضوعات کی تلاش، اور ان موضوعات

کے برتنے میں انہوں نے فن کی مضبوط گرفت کو ڈھیلا کیا۔ "خیال" کو "بیان" پر ترجیح دی۔ موضوع کو ہیئت، اسلوب، اندازِ بیان، طرزِ ادا سب پر فوقیت حاصل ہو گئی۔ اس سے بڑی حد تک شاعری کی جمالیاتی اقدار کو دھچکا سا لگا۔ اور شاعری صحافت، خطابت اور پروپیگنڈہ کے قریب پہنچ گئی۔ مگر تھوڑے ہی عرصہ بعد ترقی پسندوں کو اپنی کجروی کا احساس ہوا اور انہوں نے آہستہ آہستہ فنی دلکشیوں اور فنی خوبیوں پر بھی توجہ کی۔ جس کے لئے انہوں نے نظم کے پرانے اور مروجہ سانچوں میں ترمیم کی۔ خیالات اور جذبات کی مناسبت سے کچھ نئے ڈھانچے بنائے۔ شاعری میں نئے اشارے، نئے استعارے، نئے کنایے، صنائع بدائع، اصطلاحیں اور نئے علائم وضع کئے جس سے اردو کو ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور میں جو نقصان پہنچا تھا اس کی بڑی حد تک تلافی ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ جدید ترین ترقی پسند نظم نگاروں میں جن میں خلیل الرحمٰن اعظمی، شور علیگ، وامق جونپوری، شہاب جعفری، شہریار، شہرت بخاری، فارغ بخاری، قیوم نظر، عبدالرؤف عروج، احمد فراز، شاذ تمکنت، حمایت علی شاعر، شکیب جلالی، محمود ایاز، اور حسن حمیدی وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، کے پیشِ نظر موضوع، مواد، ہیئت، اسلوب، اور اندازِ بیان، سب کا ایک حسین امتزاج اور ایک خاص قسم کی ہم آہنگی، توازن اور تناسب رہتا ہے۔ اب شعر و ادب میں داخلیت یا افادیت، خارجیت یا جمالیات دونوں پہلوؤں کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ اس سے شاعری کو فائدہ ہی پہنچ رہا ہے، نقصان نہیں۔

سنہ ۱۹۳۰ء کے بعد سے اردو غزل پر بھی نئے موضوعات کی تلاش کا بڑا اثر ہوا ہے۔ سنہ ۳۰ء تک اردو غزل اپنے موضوعات کے اعتبار سے بالکل اچھوتی تو نہیں کہی جا سکتی کیونکہ اس وقت تک غزل نے اپنے بنیادی موضوع حسن و عشق اور محبت سے متعلق خیالات و جذبات کی ترجمانی ہی نہیں کی بلکہ اپنے گرد و پیش کے حالات و

واقعات، اپنے زمانے کی سیاسی و معاشی تبدیلیاں اور زندگی کے خارجی مسائل کی عکاسی بھی کی ہے۔ اس میں داخلیت اور خارجیت کا حسین امتزاج بھی ملتا ہے اور افادیت اور جمالیات کی مشترک قدریں بھی! گویا اپنے موضوعات کے اعتبار سے یہ کسی طرح بھی پیچھے نہیں۔ اس میں قوم پسندی بھی ہے اور وطن پرستی بھی، حریت اور انقلاب بھی ہے، سیاست اور معاشرت بھی۔ غرض ہر قسم کا موضوع زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کبھی غمِ جاناں کا پلہ بھاری ہے تو کبھی غمِ دوراں کا۔ بہر حال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ۱۹۳۰ء تک اردو غزل اپنے نئے متنوع، وسیع اور ہمہ گیر موضوعات کے اعتبار سے انیسویں صدی کی غزل سے بہت مختلف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں بھی دوسری اصنافِ شعری کی طرح اس کی مقبولیت اور اس سے دلچسپی لینے کی فضا عام ہوئی ہے۔ حسرتؔ، فانیؔ، اصغرؔ، جگرؔ، فراقؔ، اثرؔ اور آرزوؔ ان سب کی غزلوں میں اسی احساس، اسی جذبے اور اسی شعور کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

۱۹۳۰ء کے بعد غزل میں مذکورہ موضوعات کی تلاش کا یہ اثر ہوا کہ اردو غزل اپنے لب و لہجہ، زبان، اندازِ بیان، طرزِ ادا اور اپنے اسلوب کے اعتبار سے پہلے سے زیادہ دلکش، شگفتہ، حسین اور توانا ہو گئی۔ اس کے مبالغہ، تکلف، تصنع اور آورد میں بڑی حد تک کمی واقع ہو گئی جس سے اس کی ہر دلعزیزی، دلچسپی اور مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ پھر انہیں باتوں نے غزل میں حقیقت و واقعیت، فکر و گہرائی، صداقت و خلوص کا رنگ بھر دیا۔ جس سے غزل میں فلسفیانہ شان پیدا ہو گئی جو اس کی پختگی اور توانائی کی ضامن ہے۔

عشقیہ حقیقت نگاری نے اردو غزل کے احیا میں اور مردی غزل میں صداقت، واقعیت اور حقیقت کی جو داغ بیل پہلے پڑ چکی تھی، رومان پسندوں کے ہاتھوں اس رجحان کو مزید فروغ حاصل ہوا۔ اخترؔ، فراقؔ، جوشؔ، مجازؔ، ساحرؔ، ندیمؔ، حفیظؔ، ساغرؔ،

احسان، فیض اور مجروح کی غزلیں اس سلسلے میں بہترین کڑیاں ہیں۔

۱۹۳۵ء کے بعد اردو غزل بڑے نازک دور سے گزری۔ بعض شاعروں کے اشتراکی اور اشتمالی نقطۂ نظر نے غزل سے بے التفاتی اور سرد مہری کا مظاہرہ کیا۔ بدیسی حکمرانوں سے آزادی حاصل کرنے کا جذبہ اور ایک غیر طبقاتی نظامِ حیات کی تشکیل کے خواب نے بہت سے نئے موضوعات کو نظم کے نئے سانچوں میں ڈھالنے کی طرف رغبت دلائی۔ اس میں شک نہیں کہ اس عرصہ میں جوش، حفیظ، سردار، مخدوم، ندیم، ساحر، کیفی، جذبی، مجاز، فیض اور مجروح نے بڑی اچھی نظمیں لکھیں۔ مگر یہی شعرا پھر غزل کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب اور سیاسی و سماجی حالات، معاشی و معاشرتی واقعات نے بہت جلد ان شعرا کی آنکھیں کھول دیں۔ اب غزلوں میں مایوسی، اداسی، حزن و ملال، کے ساتھ ساتھ خوشیوں، مسرتوں، آرزوؤں، تمناؤں اور امنگوں کا سراغ بھی ملنے لگا۔ قنوطیت نے رجائیت کا روپ اختیار کرلیا۔ اور اسطرح غزل کی بعض پرانی روایات سے دلچسپی بڑھی۔ ناصر کاظمی، جمیل الدین عالی، طفیل احمد جمالی، حفیظ ہوشیارپوری، نکہت بریلوی، مشفق خواجہ، شہزاد احمد، فرید جاوید، آفاق صدیقی، صہبا اختر، خالد علیگ، اختر انصاری اکبرآبادی، شاعر لکھنوی، ادیب سہارنپوری، اور مظہر جمیل وغیرہ کی غزلیں اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ آج اردو غزل میں روایات کا تتبع، جمالیاتی پہلوؤں کا احساس داخلیت و خارجیت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ اب غزلوں میں میر کا سوز و گداز، مومن کا تغزل، غالب کا تفکر، اقبال کا فلسفہ، جوش، فراق اور حسرت کی عشقیہ حقیقت پسندی، اصغر کی پاکیزگی، فانی کا خلوص اور جگر کی سرمستی و رندی سب کچھ نظر آنے لگی ہے۔

——— اور یہ سب کچھ نتیجہ ہے بیسویں صدی کی اردو شاعری میں نئے نئے موضوعات کی تلاش، اور ان کے اثرات کا! اب اردو غزل اور اردو نظم دونوں اپنے موضوع، مواد، ہئیت اور اسلوب کے اعتبار سے ہم آہنگ، متوازن اور متناسب ہوتی جا رہی ہے۔ یہ بات اردو شاعری کے درخشندہ مستقبل کی ضامن اور اس کے حق میں نیک فال ہے۔

آفاق صدیقی

پیدائش :- مین پوری۔ ۴ مئی ۱۹۲۸ء ؛ وطن :- موضع شیخ پور ضلع فرخ آباد (یوپی)
ہجرت :- نومبر ۱۹۴۷ء ؛ موجودہ پتہ :- میونسپل پارک پرانہ سکھر

مشاغل

مدرس اسلامیہ ہائی اسکول سکھر (۱۹۴۸ء تا ۱۹۵۷ء) لائبریرین :- اسلامیہ کالج سکھر (۱۹۵۷ء تا اپریل ۱۹۶۱ء)

مدرس :- سینٹ میریز ہائی اسکول سکھر (اپریل ۱۹۶۱ء تا حال)

سکریٹری انجمن فروغِ ادب (۱۹۴۹ء تا ۱۹۵۳ء) سکریٹری کُل پاکستان اردو سندھی ادبی اجتماع ۱۹۵۰ء۔ مدیر ماہنامہ کوہکن (۱۹۵۱ء) سکریٹری کُل پاکستان ادبی کانفرنس (۱۹۵۳ء) سیکرٹری لطیف اکیڈمی ۱۹۵۵ء۔ سیکرٹری آل پاکستان ثقافتی کانفرنس ۱۹۵۶ء۔ سیکرٹری ادبی سوسائٹی ۱۹۵۷ء تا ۱۹۵۸ء۔ میگزین سیکرٹری اسلامیہ کالج سکھر ۱۹۵۸ء ناظم۔ کُل پاکستان رائٹرز کنونیشن ۱۹۶۱ء۔ ایڈیٹر میگزین مسلم ایجوکیشن سوسائٹی سکھر ۱۹۶۱ء۔ سیکرٹری پاکستان رائٹرز گلڈ۔ سب ریجن سکھر (۱۹۶۱ء تا حال)

تصنیف و تالیف

۱۔ پاکستانی ترانے ۲۔ کوثر و تسنیم
۳۔ مرتب۔ بوئے گل نالۂ دل ۴۔ مؤلف۔ جدید جغرافیہ
۵۔ مرتب۔ 'اردو کے دیس میں' ۶۔ قلبِ سراپا (مجموعۂ کلام زیرِ ترتیب)
۷۔ غمِ دل اگر نہ ہوتا (ناول زیرِ ترتیب)
۸۔ منتخبہ مضامین (زیرِ ترتیب)

○

زندگی اور اس دور کی زندگی — اک نئی روشنی اک نئی تیرگی ،
یہ زمیں تو زمیں ماہ و انجم پہ بھی — آگہی اپنا جادو جگانے چلی
بزمِ ہستی میں ہے کس قدر دلکشی — پھر بھی محسوس ہوتی ہے کوئی کمی
معتبر کوئی غم ہے نہ کوئی خوشی — اُف یہ تہذیبِ حاضر کی جلوہ گری
دیدنی ہے محبت کی افسردگی — جیسے مُرجھا کے رہ جائے کوئی کلی
خواہشیں، ولولے، کاوشیں، حوصلے — کتنی خوش فہمیوں میں ہے ہر آدمی
بڑھ گئیں اور بھی دل کی بے چینیاں — جی بہلنے کی جب کوئی تدبیر کی
قربتِ مہ وشاں اور جوئے رواں — بہتے پانی پہ چھٹکی ہوئی چاندنی
دیکھ کر تیری محفل کی رنگینیاں — دم بخود ہے مرے شوق کی سادگی
کیسے کیسے تماشے دکھاتا ہے دل — روپ کیا کیا بدلتی ہے فرزانگی

روحِ انسانیت اور یہ کشمکش
جیسے گرداب میں ڈوبتی سوہنی

★ ★ ★ ★

نظر نظر میں کوئی غم چھپا سا رہتا ہے
بہار ہو کہ خزاں دل بجھا سا رہتا ہے

کوئی سمجھے یا نہ سمجھے یہ غزل سرا نالے
تری ہر ادا سے پائے کئی اور استعارے

مری چشمِ خوں فشاں سے ترے حسنِ بے نشاں تک
وہی شوخ و شنگ طوفاں وہی تند و تیز دھارے

مرے عشق کا تقدس ترے حسن کا کرشمہ
کہیں اشکبار شبنم کہیں نغمہ زن ستارے

مجھے اپنی ہی صدا پر یہ گماں ہوا ہے اکثر
کسی اجنبی کو جیسے کوئی اجنبی پکارے

نہیں تجھ سے کچھ شکایت مگر اے غمِ محبت
یہ دل و نظر کی بازی کوئی جیت کر نہ ہارے

مرے ناخدا یہاں تو میں ترس گیا سکوں کو
مجھے پھر ادھر ہی لے چل نہ ملیں جدھر کنارے

یہ فریب خوردگی ہے کہ نیازِ بندگی ہے
وہ ہزار ظلم ڈھائیں کوئی پھر بھی دم نہ مارے

○

زنداں یہ اگر اتنا پراسرار نہ ہوتا
میں دیدہ و دانستہ گرفتار نہ ہوتا

گر حسنِ طلب درخورِ آزار نہ ہوتا
منصور بھی منصورِ سرِ دار نہ ہوتا

حیرت سے دو عالم کی طرف دیکھ رہا ہوں
اے کاش مجھے آپ کا دیدار نہ ہوتا

بے فیضِ جنوں لطف سرِ بام تھی ورنہ
بدنام کبھی سایۂ دیوار نہ ہوتا

ہوتا جو زمانے میں وفا کا کوئی معیار
ناکام وفا کوئی وفادار نہ ہوتا

سمجھا گئی وہ بات دروں بینیٔ احساس
تا عمر بھی جس بات کا اظہار نہ ہوتا

وہ حسنِ مجسم بھی بہ ایں گردشِ آفاق
بے لوثِ محبت کا سزاوار نہ ہوتا

○

فلک نشینوں کے احسان مند ہم نہ ہوئے
یہ مہ جبیں بجز انیسِ شبِ الم نہ ہوئے

ہمارے فن کا صلا یا خلوص کا انعام
رہے نہ ہاتھ سلامت جو سر قلم نہ ہوئے

○

چشمِ پُرنم زباں پہ تیرا نام — دل پریشان اور ڈھلتی شام
چھین لی مہ وشوں نے بینائی — آئے گا جلوۂ سحر کس کام
اُف ترے خندہ ہائے زہر آلود — ہائے میری وفا کا یہ انجام
تک رہا ہے کسی حسیں کی راہ — کاروانِ حیات گام بہ گام

دیدنی ہے متاعِ دلِ آفاق
ایک احساس وہ بھی خوں آشام

○

گوش زد ہیں ہزار افسانے — دل کی آواز کون پہچانے
کھوئے کھوئے سے چند دیوانے — کس تجسس میں ہیں خدا جانے
کس کو معلوم کن اُمیدوں پر — آگ سے کھیلتے ہیں پروانے
آج پتھرا گئیں ہیں وہ آنکھیں — رشک کرتے تھے جن پہ میخانے

آنسوؤ! چھپ سکو تو چھپ جاؤ
پھر کوئی آرہا ہے سمجھانے

ابر ہے گھٹائیں ہیں موسم بہاراں ہے
ساقیا کمی کیا ہے بند کیوں خمستاں ہے

درد کی دوا کر لیں درد لا دوا کر لیں
ایک بات مشکل ہے ایک بات آساں ہے

سوچتا ہوں لے جاؤں کس طرف سفینے کو
منتظر کنارے ہیں بے قرار طوفاں ہے

وحشتو! بڑھو آگے کوئی اجنبی آیا
پیر میں ہیں زنجیریں ہاتھ میں گریباں ہے

عشق نے مٹایا ہی عشق ہی بنائے گا
حسن کی خطا کیا ہی حسن کیوں پشیماں ہے

عرصۂ محبت میں کون سا مقام آیا
آرزو سے کیا پوچھیں آرزو بھی حیراں ہے

رحمتو ادھر جاؤ، حسرتو ادھر آؤ
اِس طرف اندھیرا ہی اُس طرف چراغاں ہے

قطعہ

کسی دوا کا اثر دیر میں بھی ہوتا ہے
مریضِ غم سے کہو اس قدر نہ گھبرائے

بڑی تلاش و تجسس کے بعد ملتی ہے
وہ زندگی کہ جسے زندگی کہا جائے

ہوک سی اُٹھی دل میں آنسوؤں نے شہ پائی
دیکھ اے غمِ دوراں پھر کسی کی یاد آئی

بے کھلی کلی دل کی بے کھلے ہی مرجھائی
تم کہاں تھے گلشن میں جب نئی بہار آئی

صبح کے اجالوں پر چھا گیا اندھیرا سا
یا سفید آنچل پر تیری زلف لہرائی

غمگسار گردانیں کس کو موردِ الزام
حیف میری بیتابی ہائے تیری خود رائی

کون ہاں وہی آفاق جانتے ہیں ہم اسکو
ہوشیار دیوانہ، باشعور سودائی

ملا نہ تجھ سا کوئی اور مہرباں مجھکو
لئے پھرا ہے ترا غم کہاں کہاں مجھکو

میں اپنی دھن میں تری جستجو کے ساتھ رہا
پکارتے ہی رہے اہلِ کارواں مجھکو

تری خوشی کیلئے ہے تو کوئی عذر نہیں
پسند آئے نہ آئے غمِ جہاں مجھکو

اس انجمن میں بھی رسوا ہے میری بیتابی
بلا رہی ہے اشاروں سے کہکشاں مجھکو

نہ پوچھ تیری جدائی میں دل پہ کیا گذری
متاعِ سوزِ غزل ہے یہ داستاں مجھکو

گیت

منزل کتنی دور ہے ساتھی ۔ منزل کتنی دور
چلتے چلتے سانجھ سویرے کتنے ہی دن بیت گئے
دُکھ سُکھ کی اس بازی میں سُکھ ہارے اور دُکھ جیت گئے
انگ انگ ہے بوجھل بوجھل ۔ پاؤں تھکن سے چور
منزل کتنی دور ہے ساتھی ۔ منزل کتنی دور
کیسے کیسے رشتے ناطے ان راہوں میں ٹوٹ گئے
کتنے ہی البیلے راہی ساتھ چلے اور چھوٹ گئے
ترسی ترسی یہ دو آنکھیں یا رستے ناسور
منزل کتنی دور ہے ساتھی ۔ منزل کتنی دور
یہ کانٹے یہ تپتی راہیں اور یہ ہم جلتے پاؤں
سوچا تھا اِس بن میں ہوگی کہیں تو ٹھنڈی چھاؤں
کبھی تو ہوگی یہ دھرتی بھی پھولوں سے بھرپور
منزل کتنی دور ہے ساتھی ۔ منزل کتنی دور

گیت

کس کو میت بناؤں ـــــ کیسے جی بہلاؤں
کھوئے ہوئے من میت کی آشا ڈگر ڈگر بھٹکائے
پل پل پر یہ دھیان وہ پیارا ہمراہی مل جائے
میں دن رات اُسی کو ڈھونڈوں پھر بھی کہیں نہ پاؤں
کس کو میت بناؤں ـــــ کیسے جی بہلاؤں
رہتا ہوں کچھ بجھا بجھا سا دل کی ٹیسیں چھپائے
راکھ کے ڈھیر میں جیسے کوئی چنگاری دب جائے
اُجڑی اُجڑی نین کی نگری کس کا پیار بساؤں
کس کو میت بناؤں ـــــ کیسے جی بہلاؤں
اپنے اپنے حال میں ہیں سب کون مرا دکھ جانے
انجانوں کی اس بستی میں کون مجھے پہچانے
کس امید پہ اے دل والو! دل کے داغ دکھاؤں
کس کو میت بناؤں ـــــ کیسے جی بہلاؤں

کیچ کی راہ میں

(پنوں کے اتفاقیہ طور پر جدا ہو جانے کے بعد)

سسی کہتی ہے۔

کہاں گیا وہ پنوں پیارا کوئی مجھے بتلائے
سکھیو! اب بھنبھور میں مجھ کو پل بھر چین نہ آئے

سوگ میں جسکے ترس رہے ہیں پیا ملن کو نین
مجھ کو گہری نیند سلا کر کدھر گئی وہ رین

آئے تھے میرے دیور بن کر کچھ کیچی سردار
لے گئے چھین کے بیری مجھ سے پریتم تیرا پیار

کھینچ رہی ہے میرے من کو کوئی سہانی آس
پنکھ لگیں اور اڑ کے پہنچوں میں پنوں تجھ پاس

بسی ہوئی ہے تن من میں اس پردیسی کی پریت
میں پنوں کی پریم دلاری پنوں میرا میت

یہ پربت یہ کڑی دھوپ اور یہ چٹیل میدان
الجھی الجھی کیچ کی راہیں میں برہن انجان

سر پہ دھول آنکھوں میں آنسو پاؤں تھکن سے چور
کس سے پوچھوں کون بتائے کیچ ہے کتنی دور

تپتی ریت بھیانک جنگل ہر گھاٹی سنسان
ڈھونڈ رہی ہیں آنکھیں تجھ کو نکل رہی ہے جان

ہاتھوں کے بل چلونگی پیارے جب نہ اٹھینگے پاؤں
مجھ کو تیری کھوج سے مطلب دھوپ ہے یا چھاؤں

کیچ:- پنوں کا وطن ـــــ بھنبھور:- سسی کا وطن

۱۴ر اگست

یہ وہی دن ہے جب سبز پرچم تلے
ہم ملے کتنی آزادیوں سے گلے

لیکے عزم و یقیں کی نئی مشعلیں
اپنے قائد کے نقشِ قدم پر چلے

یہ وہی دن ہے جو کارواں کیلئے
لیکے آیا تھا صبر آزما مرحلے

کچھ بہ لطفِ خرد کچھ بہ فیضِ جنوں
ہاتھ آئے تھے ہم کو نئے مشغلے

یہ وہی دن ہے جب اہلِ مغرب سے ہم
اپنے مشرق کا دامن چھڑا کر چلے

جاتے جاتے بھی وہ اجنبی باغباں
نو بہاروں کی سوغات لیکر ٹلے

یہ وہی دن ہے جس دن ہماجر بنے
جانے کتنے ہی ناز و نعم کے پلے

پھٹ پڑا دفعتاً کوئی آتش فشاں
آگ ایسی لگی سیکڑوں گھر جلے

یہ وہی دن ہے جس دن سے ہم آج تک
کاٹتے ہی رہے دن برے یا بھلے
منتظر ہیں کہ "تعمیرِ نو" کیلئے
سرزمینِ وطن خوب پھولے پھلے

پاگل

لوگ تجھے پاگل کہتے ہیں
کہنے دے یہ کہنے والے
ایسا کہتے ہی رہتے ہیں

اپنے بھی جب ہوں بیگانے
کون بھلا تجھکو پہچانے
تجھ پر جو کچھ بیت چکی ہے
کوئی نہ سمجھے کوئی نہ جانے
دل والے بھی اس دُنیا میں
کیسے کیسے دکھ سہتے ہیں
لوگ تجھے پاگل کہتے ہیں

تیرے ارمانوں کی دُنیا
پیار سے جب آباد ہوئی تھی
تو بھی کتنی شاد ہوئی تھی
ایک سہاگن بنکر کتنے سکھ پائے تھے
سدا سہانے دن آئے تھے
آشاؤں کی پھلواری میں
کیسے کیسے پھول کھلے تھے

من بینا کے تار بجے تھے
کتنے سندر گیت ملے تھے
لیکن اک انجانی آندھی
جس آندھی کے ساتھ میں آئے
موت کے سائے

تیرے ارمانوں کی دُنیا
تیرے جیون کی پھلواری
تیرے گیتوں کی سندرتا
موت بنی تھی
پت جھڑ رُت کی دھول اُڑی تھی
چھوٹا تیرا پریتم پیارا
ٹوٹا تیری آنکھ کا تارا
اب ہے تیرا کون سہارا

تن پر آج پھٹے کپڑے ہیں
بال کھُلے ہیں دھول جمی ہے
دیکھنے والے دیکھ رہے ہیں
تیری وحشت ایک تماشا

اکثر جسکو دیکھ کے دُنیا خوب ہنسی ہے

لیکن تو چپ چاپ کھڑی ہے   دل میں کوئی ہوک اُٹھی ہے

تیری آنکھوں کی ویرانی

یادوں کے طوفان میں پھنس کر

جانے کس کو ڈھونڈ رہی ہے

چپکے چپکے نام کسی کا جب لیتی ہے

روتے روتے ہنس دیتی ہے

جاگتے خواب میں کس کا سایہ دیکھ لیا ہے

کس کے پیچھے بھاگ رہی ہے

راتوں کے سناٹے میں بھی

جاگ رہی ہے

بھوکی پیاسی

اپنے آپ سے بھی بیگانی

جانی پہچانی دُنیا میں بھی انجانی

اے دیوانی!

جب تیرے آنسو بہتے ہیں

لوگ تجھے پاگل کہتے ہیں

"ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں"

نئی منزلوں کے نشاں اور بھی ہیں　　زمیں اور ہے آسماں اور بھی ہیں
مکیں اور بھی ہیں مکاں اور بھی ہیں　　"ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"
"ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں"

نہ کر اس چمن کی تباہی کا ماتم　　فراموش کر دے خزاں کا وہ عالم
بڑی چیز ہے یہ تمنائے پیہم　　"اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم"
"مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں"

ہزاروں ہی صیاد تھے اس چمن میں　　غریب الوطن تھے ہم اپنے وطن میں
نئی اک لگن اب ہے دل کی لگن میں　　"گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں"
"یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں"

نہ مایوس ہو اے تمنائے مضطر　　مسلسل کسی حسن کی جستجو کر
نہیں کوئی شے سعیِ پیہم سے بہتر　　"قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر"
"چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں"

عجم یا عرب میں اُلجھ کر نہ رہ جا کسی تاب و تب میں اُلجھ کر نہ رہ جا
کہاں اور کب میں اُلجھ کر نہ رہ جا "اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا"
"کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں"

کہیں ہر طرف سے اُمنڈتی گھٹائیں کہیں چار سو سنسناتی ہوائیں
ہجوم آفریں ہر جرس کی صدائیں "تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں"
"یہاں سیکڑوں کارواں اور بھی ہیں"

زمانے میں روشن ہو پھر نام تیرا دلوں میں اُتر جائے پیغام تیرا
نہ آغاز تیرا نہ انجام تیرا "تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا"
"ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں"

ادب کا مقصد

تم نے پوچھا ہے ادب کا مقصد
اور میں سوچ میں ہوں
کیا بتاؤں میں تمھیں
روحِ رواں کا مقصد

نکہتِ گُل ہے ادب
سیرِ گلستاں ہے ادب
اشکِ شبنم ہے ادب
نغمۂ بلبل ہے ادب
کچھ مہکتے ہوئے پھولوں کی کشش
چند کانٹوں کی خلش

تم نے پوچھا ہے ادب کا مقصد
اور میں سوچ میں ہوں
کیا بتاؤں میں تمھیں

حاصلِ سود و زیاں کا مقصد
یعنی آوارگیٔ کوئے بتاں کا مقصد
چند جلووں کی پرستش ہے ادب
ساحرِ حسن و محبت ہے ادب
خود تراشیدہ خداؤں کا بھرم
روحِ آذر ہے ادب

تم نے پوچھا ہے ادب کا مقصد
سرخیٔ رنگِ شفق کا مقصد
تابشِ خونِ غریباں ہے ادب
رونقِ عارضِ گلگوں ہے ادب
چشمِ ساقی ہے ادب
لغزشِ رنداں ہے ادب
مستیٔ قلب و نظر
تلخیٔ کام و دہن
جامِ جمشید ادب
ساغرِ سقراط ادب
تم نے پوچھا ہے ادب کا مقصد

عالمِ تیرہ شبی کا مقصد
نشۂ خوابِ گراں کا مقصد
ماہ و انجم کے دلوں کا پندار
ایک نا دیدہ سحر کے آثار
ٹمٹماتی ہوئی لو دیتے ہوئے چند چراغ
سرمئی آنچ میں جلتے ہوئے کچھ پروانے
خونِ مہتاب ادب
جلوۂ خورشید ادب

تم نے پوچھا ہے ادب کا مقصد
کیا بتاؤں میں تمھیں
کچھ ادیبوں کی اجارہ داری
اپنی مرضی سے ادب کی تقسیم
منصبِ لوح و قلم کی تخصیص
پا بہ زنجیر ادب
زلفِ پنجاب ادب
گیسوئے بنگال ادب

کچھ یہ کہتے ہیں کہ پابندِ رسوم مذہب

کچھ سمجھتے ہیں کہ اربابِ سیاست کا نقیب
اور میں سوچ میں ہوں

تم نے پوچھا ہے ادب کا مقصد
سب زبانوں کا ادب
نوعِ بشر کی تقدیر
نغمۂ امن و اماں
میرے بچے کا تبسم مری بیوی کا سہاگ
لذتِ عمرِ رواں کا ابہام
ایک بے نام خلش

شیخ ایاز

ترجمہ :۔ آفاق صدیقی

ساون آیا

ساون آیا گھری گھری سی ہریالی چھائی
ہائے کلی مرجھائے من کی اب بھی نہ مسکائی

بھیگی ہوائیں چاندنی راتیں تیر کسے تنہائی
من کے گھاؤ ہوئے پھر گھائل یاد کسی کی آئی

کسی کسی کو مل جاتا ہے تیرے من کا موتی
ساگر سے بھی گہری تیری آنکھوں کی گہرائی

میری آنکھیں جیسے بھک منگوں کی خالی جھولی
تیری آنکھیں مے کے پیالے جب چاہی چھلکائی

جلتی جوت کہاں دیپک کی اب ہے اک چنگاری
پھر کیوں چاروں اور پتنگو! تم نے بھیڑ لگائی

رات ہماری روح میں کوئی راگ ازل سے آیا
تن من میں اک آگ سی بھڑکی بات تری بن آئی

پریتم رات کوی کے جوہر دیکھ کے تم یہ کہتے
گیت کے ہر اک بول نے کیسے جگ سندرتا پائی

یاد ایاز سجن کو کر کے ساون کے دن بیتے
مینھ بھی لیکر نیہا نہ آیا ہو گئی پریت پرائی

شیخ عبدالرزاق راز

ترجمہ :- آفاق صدیقی

مومل کی بیقراری

دیکھتی ہے چودھویں کی چاندنی
کاک میں بھی شکل اپنے چاند کی
لے چلی مجھ کو "لڈوانے" کی طرف
پھر وصالِ یار کی وارفتگی

کاک میں ہیں ان غریبوں کے مزار
عشق میں مارے گئے جو شہریار
دفن ہیں اس خاک میں وہ بیقرار
مرمٹے مومل پہ جو پروانہ وار
کہہ رہی ہے کچھ زبانِ حال سے
حسرتیں ان تربتوں کی بار بار

ہنس رہی ہے چودھویں کی چاندنی
کون جانے آج کس کے حال پر
جن میں اُلجھے تاجدار و شہسوار
ان حسینوں کے انوکھے جال پر
یا شہیدانِ نگاہِ ناز کے
خوں چکیدہ بیش قیمت مال پر

سینکڑوں دل ہو گئے جس کا شکار
اب وہ چشمِ خونفشاں ہے اشکبار
ہنس رہی ہے چودھویں کی چاندنی

مینڈھرے کی راہ میں آنکھیں بچھائے

صبح سے اب شام تک کوے اڑائے
منتظر ہے، کوئی قاصد اسکا آئے
یا وہ خود آکر مجھے سینے لگائے
پھر وہی ہمبستری دل کو لبھائے
رات میٹھی لوریاں دے کر سلائے

ہر گھڑی بیم و رجا میں اک ستیز
ہر نفس سوزِ دروں سے شعلہ ریز
جب نظر آتا ہے کوئی شہسوار
دل کی دھڑکن اور ہو جاتی ہے تیز
سوچتی ہے میرا پیار آگیا
ہے اُسی کے اونٹ کی یہ جست و خیز

جب پتہ چلتا ہے کوئی اور تھا
دفعتاً مایوس ہو جاتی ہے وہ
آنسوؤں میں ڈوب سا جاتا ہے دل
پیار کی یادوں میں کھو جاتی ہے وہ

کوئی قاصد ہے نہ کچھ پیغام ہے
حسرتیں ہیں اور غم کی شام ہے
ہنس رہی ہے، چودھویں کی چاندنی

رات بھر کرتی ہے تاروں کا شمار
یا گنا کرتی ہے اپنے ہی مزار
جو کبھی اس کے لئے تھے بیقرار
آج یہ اُن کے لئے ہے اشکبار
ہنس رہی ہے، چودھویں کی چاندنی

آج بے تعبیر ہیں محلوں کے خواب
عشق لایا ہے عجب یہ انقلاب
اسکے بالوں پہ اُڑا کرتی ہے دھول
جس کی چوٹی میں مہکتے تھے گلاب
دوسروں کو دردِ دل دیتی تھی جو
آج وہ خود ہے سراپا اضطراب
ہنس رہی ہے چودھویں کی چاندنی

شیخ عبدالرزاق راز

نام:- شیخ عبدالرزاق تخلص:- رازؔ پیدائش:- سنہ ۱۹۱۹ء

وطن:- سکھر تعلیم:- ایم۔ اے

مشاغل

ایڈیٹر ہفت روزہ الوحید کراچی (سنہ ۱۹۴۷ء تا سنہ ۱۹۴۸ء)

چیف آفیسر سکھر میونسپلٹی (سنہ ۱۹۴۸ء تا سنہ ۱۹۵۴ء)

لیکچرر (تاریخ۔ سندھی) اسلامیہ کالج سکھر (سنہ ۱۹۵۵ء تا حال)

چیرمین لطیف اکیڈمی (سنہ ۱۹۵۶ء) سکریٹری ڈسٹرکٹ کلچرل ایسوسی ایشن سنہ ۱۹۵۸ء تا سنہ ۱۹۵۹ء)

رکن عاملہ مجلسِ ادب سکھر (سنہ ۱۹۶۰ء تا حال) رکن عاملہ مہران کلچرل ایسوسی ایشن (سنہ ۱۹۶۱ء تا حال)

رکن رائٹرز گلڈ مجلس عاملہ سب ریجن سکھر (سنہ ۱۹۶۱ء تا حال)

تصانیف

۱۔ سارنگ (سندھی مجموعۂ کلام)

۲۔ ڈاک بنگلہ (افسانوں کا مجموعہ)

۳۔ فاتح سندھ (ناولٹ)

۴۔ سلطنت دہلی (سندھی تاریخ)

۵۔ "ماروی کے دیس میں" (سندھی کی عوامی کہانیوں کا اردو مجموعہ)

۶۔ اردو مقالات جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے

۷۔ Sukkur Past and Present (انگریزی میں سکھر کی ثقافتی تاریخ)

رہڑی کے دو درویش

قدیم سندھ میں سیوہن، بکھر، ٹھٹھ علم و ادب کے مرکز بنے ہوئے تھے اسی زمانہ میں روہڑی اہلِ تصوف و اولیاء اللہ کا مسکن بنا ہوا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ٹھٹھ میں سوا لاکھ بزرگانِ دین کے مزارات ہیں اور روہڑی کے لئے بھی اسی طرح مشہور ہے۔ تالپوروں کے آخری دور میں روہڑی میں میر جان اللہ شاہ ایک کامل بزرگ گزرے ہیں۔ ان کے خلیفہ محمد محسن تھے۔ خلیفہ محمد حسن اولادِ نرینہ سے محروم تھے۔ ایک دن اپنے مرشد کے دربار میں مغموم بیٹھے تھے۔ افسردگی کی وجہ پوچھی گئی، عرض کیا کہ پیر و مرشد! نرینہ اولاد سے محروم ہوں۔ بارگاہِ ایزدی میں دعا کیجئے کہ مراد بر آئے۔ مرشد نے فرمایا انشاء اللہ تمہیں ایک لڑکا ہوگا۔ جو صاحبِ کمال اور صاحبِ تصوف ہوگا، گو ایک پیر سے لنگڑا ہوگا لیکن روہڑی شہر کا پرچم ہوگا۔ یہ دعا بابِ قبول تک پہنچی اور مستجاب ہوئی۔ خلیفہ محمد محسن کے گھر ایک بچہ تولد ہوا جس کا نام عبدالقادر رکھا گیا، جو آگے چل کر عبدالقادر کے نام سے مشہور ہوا۔ میرے مضمون کے ایک درویش یہی صاحب ہیں اور دوسرے ان کے فرزند محمد محسن بیکس ہیں۔

علم و ادب کی منزلیں طے کرتے ہوئے بیدل کم عمری میں فارغ التحصیل ہوئے۔ بچپن سے ہی ان کی طبیعت عجیب و غریب تھی اور اندازہ لگایا جاتا تھا کہ وہ کوئی غیر معمولی شخصیت کے مالک ہیں ان کی تصنیفات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں قرآن، حدیث، فقہ، فلسفہ، ادب اور فارسی، عربی

زبانوں پر کافی عبور تھا۔ ظاہری علم و روحانی فیض حاصل کرنے کے لئے انھیں کئی بار سفر کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں۔ انھیں قلندر شہباز کی زیارت کا اشتیاق ہوا۔ کہتے ہیں کہ بیدل نے تین رات متواتر ایک لنگوٹ بند ملنگ کو خواب میں دیکھا جو ان سے کہنے لگے کہ "ہمارے پاس آجاؤ"۔ قلندر شہباز کی درگاہ میں سیون پہنچے اور روحانی فیض حاصل کیا۔ ان کی مسدس سے ان کی عقیدت کا پتہ چلتا ہے جس کا ایک بند پیش کر رہا ہوں جس سے آج سے ایک سو سال پہلے سندھ میں اردو زبان کی مقبولیت کا اظہار ہوتا ہے

دلا مت ڈر ز ہولِ روزِ محشر   پکڑے دامن ابنِ پیمبر
شہ شاہاں عرفاں دین پرور   قطب ارشاد عشاقاں کا رہبر
مرا مرشد مکمل ہے قلندر   حسینی حیدر سلطان سرور

سیون سے بیدل پیر گوٹھ آئے اور حضرت پیر محمد راشد کے روضہ میں معتکف رہے۔ پیر صاحب پاگارو کے فرزند ارجمند پیر علی گوہر شاہ کے اتالیق مقرر ہوئے۔ بیدل کی صحبت اور تعلیم کے فیض سے صاحبزادہ پیر علی گوہر شاہ سندھ کے اعلیٰ درجہ کے شاعر بن گئے۔ بیدل پیر گوٹھ سے پریالو جو روہڑی سے تقریباً ۸ میل کے فاصلے پر ہے وہاں پہنچے اور مخدوم محمد اسمٰعیل کی درگاہ سے روحانی فیض حاصل کرنے کے بعد وہ روہڑی واپس لوٹے۔ بیدل نے دورانِ سیاحت میں شاہ عبداللطیف بھٹائی، مخدوم نوح، سچل سرمست وغیرہ کے مزارات کی زیارت کی۔ اور اس دور کے زندہ صوفیائے کرام کے فیض سے مستفیض ہوتے۔

بیدل کی شاعری میں تصوف، وحدانیت، حقیقت اور معرفت کی بھینی بھینی خوشبو ملے گی۔ مجاز کی وہ نمایاں جھلک ہے جس سے انسان فنا فی اللہ کے درجہ پر پہنچ جاتا ہے۔ بیدل کی شاعری کا رنگ ہندی اور فارسی علوم کا نچوڑ ہے۔ بیدل کی شاعری دو حصوں میں تقسیم کی جاتی ہے۔ ایک بیدل کا قدیم رنگ جو ہندی دوہے کی طرز پر لکھا گیا ہے جس میں متقدمین کا تتبع کیا گیا ہے اور اس میں ہندی دوہے کے قواعد و ضوابط کو عمل میں لایا گیا ہے۔ چونکہ بیدل ایک بڑے عالم تھے اور فارسی زبان میں

کافی دسترس رکھتے تھے اس لئے فارسی علم عروض سے بھی واقف تھے۔ اور ان کا کلام فارسی علم عروض کی بحروں میں کہا گیا ہے۔ سندھی زبان کے علاوہ ان کا کلام عربی، فارسی، سرائیکی اور اردو زبانوں میں بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ بیدل نے شعر کی ہر صنف کو اپنایا ہے۔ بیدل کے کلام میں اسلوب بیان کی سادگی اور تخیل کی بلند پروازی خاص طور پر نمایاں ہے۔ کلام سے رندانہ مستی، جوش اور مدہوشی ٹپکتی ہے۔ مجازی کی منزلیں طے کر کے حقیقت کو پالینا ان کے کلام کی روح ہے۔ محبوب اور جمالِ مطلق کو تلاش کرنے کی کوششیں آخر محبوب کا مکان ڈھونڈھ ہی لیتی ہیں۔ سندھی شاعری میں کافی ایک مشہور اور مقبول صنف ہے وہ ہر خاص و عام، دیہاتی، شہری، عورت، مرد کے لئے یکساں جاذبیت رکھتی ہے۔ کافی کی ابتدار شاہ عبداللطیف کے وائی کی صورت سے ہوتی ہے اور سچل سرمست اس صنف کو موجودہ کافی کی صورت دیتا ہے۔ شاہ لطیف کی وائی ہندی دوہے کے اصول پر بنائی گئی ہے لیکن سچل نے کافی کو علم عروض کے قواعد کی پابندی سے بھی روشناس کرایا ہے۔ کافی نے سچل سرمست کے دور میں عروج حاصل کیا اور یہ صنف عوامی شاعری بن گئی اور عوام نے اسے اپنایا۔ بیدل پر سچل سرمست کی شاعری کا کافی اثر پڑ چکا ہے اور بیدل نے خیال اور فن میں سچل کی تقلید کی ہے۔ بیدل کی سچل سرمست سے عقیدت مندرجہ ذیل اشعار سے ظاہر ہوتی ہے۔

عشق جو یارو درازن ۾ عجب اسرار هو — مست سالڪ مه سچو عارف اني اظهار هو

قربدارن جي ڪٽڪ ۾ مرد منصبدار هو — ور تنهن داتا جي بيدل بهت جو بينار هو

درازہ شہر میں عشق کا عجب اسرار تھا اور وہاں ایک مست سالک اور عارف باللہ سچو نامی تھا۔ عاشقوں کی فوج کا وہ مرد مجاہد منصب دار تھا۔ اس داتا کے دروازے پر بیدل محبت کی بھیک کا بھکاری تھا۔

بیدل نے وطن کی محبت میں چند اچھے اشعار کہے ہیں۔ متقدمین میں ہر ایک شاعر کو اپنے وطن سے بیحد محبت تھی۔ شاہ کریم۔ شاہ لطیف، سچل سرمست وغیرہ نے اپنے وطن کی محبت میں سیکڑوں، اشعار

کھے ہیں۔ بیدل نے حب الوطنی کا ثبوت مندرجہ ذیل فارسی اشعار میں پیش کیا ہے۔

حبِ وطن از ملکِ سلیماں خوشتر　　　　خارِ وطن از سنبل وریحاں خوشتر

پھر کہتے ہیں

مگر ایں بلدہ چوں بیت العتیق است　　　　کہ جائے طوف مردانِ طریق است

مندرجہ بالا اشعار سے بیدل کی فارسی شاعری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور ان کی قادر الکلامی اور علم و ادب پر عبور حاصل کرنے کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ فراقِ یار میں ایک کافی کے چند ابیات پیش کرتا ہوں۔

توھون ڌاران سپرين - دل کي ناھ قرار　　　　جيئڙو جنجال اسان جو

مل تہ ماندائي لھي - نہ مل ڦي نھوار　　　　منٿ ميچ سوال اسان جو

میرے محبوب تیرے سوا دل کو قرار نہیں، ہمارا جینا دوبھر ہو گیا ہے۔ آکر ملو، روشن ہو کر ظاہر ہو جاؤ تو مایوسی ہٹ جائے۔ اے پیارے ہماری اس عرض کو قبول کر لو۔

فراقِ یار کا ذکر کس خوش اسلوبی سے کیا جا رہا ہے۔ زبان کی شگفتگی طبیعت کو بشاش کر دیتی ہے۔ اظہار میں کتنی سادگی ہے۔ سندھی زبان کے روز مرہ کے استعمال کے الفاظ اس طرح پروئے گئے ہیں جس سے شاعری کی فصاحت کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

پکيڙ اولر کان ڇڙ يا وڃي اوکي منجھا ٿيا　　　　زھري زلف نہ در آڏر جا تو کي دھڙ دام پيا

دغول سے پرندے جدا ہوتے اور جا کر مصیبت میں پھنس گئے۔ طاقتور محبوب کی زلفوں کے گھیرے دام پڑ گئے)　　بیدل کی شاعری کا ذرا اور رنگ بھی دیکھ لیجئے۔

وجود ایک ہے بس لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُو۔

نہ کر دوئی کی ہوس لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُو

وہی ہے قافلہ سالار دشت پیمائی
وہی ہے بانگِ جرس لَا اِلٰہَ اِلَّا ہُو

اس سے اردو داں طبقہ سوا سو سال پہلے سندھی شاعری کی اردو شاعری کا اندازہ لگا سکتا ہے کہ سندھ کا علم شناس طبقہ اردو زبان سے کتنی انیست رکھتا تھا۔ بیدل سے پہلے سچل سرمست کا اردو کلام بھی سرزمین سندھ کے لئے باعثِ فخر ہے۔

محفل بجنت میں ممتاز ہیں اربابِ علوم — محکمہ عشق میں منظور ہے منصور کی بات
بس کہیں نین تیرے ناز کے ساغر میں مست — کیا کروں اس کے آگے نرگسِ مخمور کی بات

چھوٹی بحر میں گویا میر کا رنگ ٹپکتا ہے۔ کہتے ہیں۔

رات تجھ بن پکار رکھتے ہیں — دن سبھو انتظار رکھتے ہیں
برقِ رخسار کے تماشہ میں — دیدۂ ابرِ بہار رکھتے ہیں

ایک اور غزل کا مقطع ملاحظہ فرمائیے۔

تیری گلی کے خاک کو بیدل کے واسطے — غالیہ کہوں، عبیر کہوں، طوطیا کہوں

اتنے بڑے مفکر، فنکار اور درویش کا مزار روہڑی میں ہے۔ وہاں ہر ہفتہ محفلِ سماع ہوا کرتی ہے۔ بیدل کئی ایک تصنیفات کے ساتھ اردو کے بھی صاحبِ دیوان تھے۔

دوسرے درویش بیدل کے فرزند میاں محمد حسن تھے۔ والد کی صحبت میں رہتے تھے اور یکیس تخلص رکھتے تھے۔ چودہ برس کی عمر میں یتیم ہو گئے، فاضل باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ شفیق باپ سے فیض حاصل کئے ہوئے تھے۔ صغر سنی ہی میں شعر کہتے تھے۔ فرماتے ہیں۔

ڪٿي عاشق هيرا هيرا ڪٿي تير انداز
(کہیں عاشق ٹکڑے ٹکڑے، کہیں تیر انداز ہے)

سندھی میں ہیرا ہیرا کے الفاظ بالکل عوامی ہیں اور محاورہ کی صورت اختیار کرتے ہیں۔

بیکس کی تعلیم و تربیت کا کام خود بیدل نے سرانجام دیا۔ انہوں نے فارسی، عربی اور اردو کا کافی مطالعہ کیا اور اپنے والدِ بزرگوار کے نقشِ قدم پر چلنے کو اپنی کامیابی سمجھتے رہے۔ بیدل کا کردار ان کے لئے مشعلِ راہ بنتا گیا۔ اور وہ بچپن ہی سے اسی رنگ میں رنگ گئے۔ والد کی زندگی میں وہ نہایت ناز و نعم سے پلے انہیں خوبصورت اور رنگین کپڑے پہننے کا شوق تھا اور خود بھی بیحد حسین تھے فقر و غنا کی یہ کیفیت تھی کہ اگر کسی ہم عمر کو پھٹے پرانے کپڑوں میں دیکھ لیتے تو سرِ راہ اپنے کپڑے اُسے پہنا دیتے اور نہایت مسرور ہوتے۔ والد کی وفات کے بعد وہ خدا کے برگزیدہ بندوں کی صحبت میں رہا کرتے اور ان کی صحبت سے فیض حاصل کرتے۔ وہ باپ کی طرح قلندر شہباز کے خاص معتقد تھے۔ فرماتے ہیں۔

دردمندن کي ڏيئين درمان تون — مونتي ڪر ڪو عشق جا احسان تون
بخش بحر و بر جو سلطان تون — هن جهان جي آهين بيشڪ جان تون

يا قلندر شاهه سيوهڻ جا سدا
ڪر نظر بيڪس بندي تي لڳ خدا

دردمندوں کو تم درماں دیتے ہو۔ مجھ پر عشق کے احسان کرو۔ سلطان محبت کا کچھ حصہ دیدو۔ اس جہاں کی بے شک تم جان ہو۔ اے قلندر سیون کے شاہ، خدارا مجھ بیکس بندہ پر ایک نظر کر۔

بیکس خوش گلو تھے اور ستار پر گانا گایا کرتے تھے۔ ان کی شاعری میں موسیقی بھری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ طبیعت کے لاابالی اور نہایت آزاد خیال تھے۔ بیکس کی کافی کا نمونہ پیش کرتا ہوں۔

نت نهاريان راهه - اديون اباڻن جي

بن عمر جا باغ باغيچا۔ هت گلزاريون کيون گاه
مارئي ماندي قسمت آندي سانگي ساڻ ساه

بہنو! ہمیشہ اپنے کنبہ والوں کی راہ دیکھتی ہوں ۔ اے عمر! تمہارے باغ اور باغیچے جہنم میں جائیں ۔ وہاں گھاس نے سبزی اور شادابی پیدا کرلی ہے ۔ بے چین ماروی کو مقدر یہاں پر کھینچ لایا۔ جس کا دل اپنے سانگیوں (اپنی قوم والیوں) کو یاد کرتا ہے۔

مندرجہ بالا اشعار میں سندھ کی عوامی کہانی کی ہیروئین ماروی کو پیش کیا گیا ہے جس سے اس دیہاتی لڑکی کے بلند کردار کا اندازہ لگایا جاتا ہے ۔

بیکس کی عظیم شخصیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جس منزل پر وہ پہنچ چکے تھے اس کی شہادت میں حسب ذیل ابیات اچھی خاص سند کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ گویا منصور کا نعرہ اور شمس تبریز کی روح نمایاں ہے۔

عشقون تو عبد سڏ ايان ۔ آهيان ٿان الله ‎ ‎ ‎ ‎ ‎ هتي ٻانهو ٻانهن جيان هتي ي شهنشاه

عشق کی وجہ سے بندہ کہلوا تا ہوں ورنہ خود اللہ ہوں ۔ یہاں غلاموں جیسا غلام ہوں وہاں شہنشاہ ہوں

عام طور پر بیکس کو حسن و عشق کا شاعر کہا جاتا ہے ۔ ان کے ہاں مجاز زیادہ نظر آتا ہے ۔ ایک بیس سالہ نوخیز جوان کے جذباتِ حسن کی دلفریبیوں کو کیسے نظر انداز کر سکتے تھے ۔ فرماتے ہیں ۔

اهي نازپرور ديون نازڪ نماڻيون
عشاقن کي ڪهڻ لاءِ شايد سماڻيون
تکا تير مڙگن جا بيشڪ هڻن ٿيون

(وہ نازپرورده اور نازک عاشقوں کو ذبح کرنے کے لئے شاید پروان چڑھی ہیں جو مژگان کے تیز تیر مار رہی ہیں)

سرائیکی زبان میں فرماتے ہیں۔

جيڙ ڄهيندا جاني جاني دم دم دلڙي ٿي ديواني

جاني دامت ڪوئي نهين ثاني سڀني دا هي سرتاج

(ہر سانس جانی جانی پکار رہی ہے اور دل ہر لمحہ دیوانہ ہوا جاتا ہے۔ میرے محبوب کا کوئی بدل ہے نہ ثانی اور وہ سب کا سرتاج ہے)

سندھی میں کہتے ہیں۔

رازن محرم رس نہ یار آ تہ پر چوٹ پاٹ ہم

(اے راز محرم دوست روٹھ نہ جا۔ آجا کہ آپس میں مل جائیں)

اندھیری رات میں جب ستار کے تاروں سے مضراب چھو جاتا تو فضا جھوم جاتی ستارے رقص کرنے لگتے۔ شاعر کے دلپذیر اور دلگداز اشعارات کی خاموشی میں روڑی شہر کی گلیوں میں گونج اُٹھتے اور لوگ جوق در جوق آکر شاعر کے گرد اکٹھے ہوتے جیسے شمع کے پیچھے پروانے۔ وہ جواں سال درویش ۲۳ برس کی عمر میں فوت ہو گئے۔ وفات سے تین روز پہلے ایک سندھی کافی لکھ کر گاتے رہے۔ فرماتے ہیں۔

ڪڏهن راضي ٿيندين راڻا۔ ڪڏهن موٽي ملندين راڻا

ڪاڪ ڪهاڻي ويل وهاڻي۔ ٻينگ ٿيا سڀ ڀاڻا

(پریتم! تو کب راضی ہوگا کب واپس آکر ملو گے۔ پریتم! کاک کی کہانی ختم ہو گئی۔ اور وقت گذر گیا۔ سب ٹھکانے ویران ہو گئے)

سامعین مصرع ثانی سن کر تڑپ اُٹھے۔ عرض کیا کہ بدل دیجئے۔ بیکس نے فرمایا۔ لکھنے والا لکھ گیا اب کوئی بدل نہیں سکتا۔

بیدل

ترجمہ :- راز

کافی

دیکھ لے یہ عشق کے اسرار دیکھ
دیکھ ہر صورت میں میرا یار دیکھ

دیکھ ظاہر ہو گیا پردہ نشیں
وہ ہزاروں صورتوں میں ہے عیاں
دیکھ لے کثرت میں میرا یار ہے

یار نے دیکھا تماشا حسن کا
خود بخود محوِ تماشا ہو گیا
دیکھ ہر وحدت میں میرا یار ہے

بیٹھتے اٹھتے یہی کہتے رہے
درد سے ہوتی ہے دل میں روشنی
درد سے مٹتا ہے ہر وہم و گماں
دیکھ کس حالت میں میرا یار ہے

دیکھ بیدل چھوڑنا ہرگز نہیں
اپنے ہاتھوں سے محبت کی زمام
دیکھ ہر صورت میں میرا یار ہے

دیکھ ہر صورت میں میرا یار ہے

بکیس
ترجمہ :- راز

کافی

آجا روٹھ کے پریتم پیارے جیا بہت گھبرائے
آگ لگی ہے من میں ایسی جان جگر کو کھائے
رات برہ کی آئی ساجن گھائل من گھبرائے
نیند کو ترسیں بیاکل نینا پل بھر نیند نہ آئے
برہ کی ماری ہوں براگن دم بھر جیا نہ جائے
داسی تیری تجھ سے مالک! کیسے نیہا لگائے
تجھے بسا کر نینوں میں اب کس کا پیار لبھائے
آجا پریتم پیارے تجھ بن منوا شور مچائے
سن لے بِنتی بکیس کی داتا تیرا مان بڑھائے
پھول چنوں چرنوں میں تیرے در در کیوں بھٹکائے

سندھ کا شہزادہ شاعر

سندھی شاعری، وادیٔ مہران کی ایک لطیف صنفِ ادب بنکر قریباً چار سو برس سے سندھی عوام کے دلوں پر سکہ جما چکی ہے۔ چونکہ سندھ کو راجستھان، کاٹھیاواڑ سے قریبی تعلق رہا ہے اس لئے یہ صنف ہندی شاعری کی مرہونِ منت رہی۔ سندھ میں ایک طویل عرصہ سے فارسی کا دور دورہ تھا لیکن سندھی شاعری کا فارسی شاعری کے اصولوں سے گریز، سندھی شعراء کی بھاشا سے دلچسپی کی ایک کھلی دلیل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سندھ کے ایرانی حکمرانوں کے ثقافتی اور لسانی پروپیگنڈے کا ردعمل ہو۔ سندھی عوام کا تو حکومت کی دفتری زبان سے دور کا واسطہ بھی نہ رہا۔ اس لئے شعراء کی دور بین نظر نے عوام کا جائزہ لے لیا۔ اور اپنا پیغام اسی لب و لہجہ میں لوگوں تک پہنچایا جس سے وہ مانوس تھے۔

سندھ میں ہندی دوہے کثرت سے گائے جاتے تھے اور سندھ کے بلند پایہ شاعر ہندی شعراء کا کلام اکثر و بیشتر پڑھا کرتے تھے۔ اس خطہ میں تعلیم یافتہ طبقہ کی تعداد کم تھی۔ اس لئے فارسی زبان کی شاعری سندھی عوام کے لئے ناکارہ بن کر رہ گئی اور سندھی شعراء نے عوام کی زبان اور محاورے استعمال کر کے اپنی شاعری کو مؤثر اور کامیاب بنایا۔ اس قسم کی شاعری نے شاہ کریم، شاہ لطیف، شاہ عنایت، سچل اور بیدل وغیرہ کو زندۂ جاوید بنا دیا۔ اس اسلوب کی شاعری سندھ پر صدیوں تک حکومت کرتی رہی۔ حکومتیں بدلتی رہیں اور شعراء اسی صنف میں نئے نئے تجربے کرتے رہے۔ آخر وہ دن آئے جب سندھی شاعری نے فارسی عروض کا اثر قبول کیا۔ اور انیسویں صدی کے وسط میں غزل کی شاعری سندھی زبان میں رائج ہوئی۔ فارسی ٹکنک

کے اصولوں کو اپنانے کی کوشش کی گئی اور اردو شاعری سے متاثر ہو کر اردو غزل کا اثر قبول کر لیا گیا۔ اس مکتبِ فکر کے بانی خلیفہ گل ہیں۔ جن کی غزلوں کا ایک دیوان انیسویں صدی کے ابتدائی دور میں چھپکر شائع ہوا تھا۔ یہ سندھی زبان کا پہلا اور مکمل دیوان ہے۔

گذشتہ صدی کے اواخر میں سندھی زبان کے کئی ایک غزل گو شعراء پیدا ہوئے جنہیں سانگی کو غزل کا شہنشاہ تسلیم کیا گیا ہے۔ سندھ کی غزلیہ شاعری ایک مختلف ماحول میں پل کر جوان ہوئی۔ یہ شاعری اصلیت اور حقیقت پر مبنی ہے اور اس میں چھچھورے جذبات اور سطحی احساسات کا کوئی دخل نہیں ہے۔ سانگی اس قسم کی شاعری کے استاد اور رہبر تھے۔ سانگی نے یوں تو ہر صنفِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن انہوں نے اپنی جدتِ طبع سے سندھی غزل کی صنف میں چار چاند لگا دیئے۔ سانگی سندھ کے آخری تالپور حکمران میر محمد نصیر خان کے پوتے اور شہزادہ میر عباس علی کے صاحبزادے تھے۔ ان کا نام ہز ہائنس میر عبدالحسین تھا اور سانگی تخلص کرتے تھے ۱۸۴۳ء میں سندھ کی فتح کے بعد حکومت برطانیہ کے اراکین نے سندھ کے سابق حکمران خاندان کو کلکتہ میں نظر بند رکھا۔ سانگی اس "پُر آشوب" زمانہ میں کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ ایک یوروپین خاتون تھیں۔ بارہ برس کی عمر میں سانگی اس غریب الوطن خاندان کے ساتھ آزاد ہو کر اپنے وطن لوٹ آئے۔ سانگی اپنی جائے ولادت کو ہمیشہ یاد کرتے تھے ؎

پیاریج پرت جو پیالو، اَلَا یَا اَیُّھَا السَّاقِی

اسان جو ملک بنگالو، اَلَا یَا اَیُّھَا السَّاقِی

"پلا دے پریت کا پیالہ اَلَا یَا اَیُّھَا السَّاقِی ہمارا ملک بنگالہ اَلَا یَا اَیُّھَا السَّاقِی"

سندھ میں انہیں اچھی تعلیم و تربیت ملتی رہی۔ قدرت نے انہیں ایک رنگین اور موزوں طبیعت عطا کی تھی۔ شکار کے بڑے دلدادہ تھے۔ عالم شباب میں ایکبار شکار

کرتے ہوئے خود شکار ہو گئے۔ ایک ماہی گیر (مچھیرے) کی خوبصورت اور نوخیز لڑکی سے آنکھ لڑ گئی اور دل دے بیٹھے۔ انتہائی مخالفت کے باوجود اس لڑکی سے نکاح کرلیا۔ اور لڑکی کی سادہ دلی، وفا شعاری اور اخلاق کے گردیدہ ہو گئے۔ گویا اس کی آنکھ کے اشارے پر جان نثار کرنے لگے۔ لیکن افسوس کہ یہ شادی بار آور نہیں ہو سکی۔ اور مختصر عرصہ میں وہ سانگی کو داغِ مفارقت دے کر اس دنیا سے کوچ کر گئیں۔ سانگی ہوش و حواس کھو بیٹھے اور ننگے پاؤں، ننگے سر صحرا نوردی کرتے رہے۔ بزرگوں کی کوشش سے ڈاکٹر رائیٹ کی صاحبزادی سانگی کے لیے مسیحا ثابت ہوئیں اور فوراً مس رائیٹ کو مسلمان کر کے نکاح پڑھوایا گیا۔ سانگی کے پرانے زخم دھلنے لگے۔ اور مس رائیٹ سے ان کے یہاں دو فرزند تولد ہوئے۔

سانگی حکومت برطانیہ سے بارہ سو روپے ماہوار بطور پنشن پاتے تھے اور ایک طویل عرصہ تک فرسٹ کلاس اسپیشل مجسٹریٹ کے فرائض بحسن و خوبی سرانجام دیتے رہے۔ سانگی کی شاعری کے ابتدائی دور سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہندی ٹکنک کے اصولوں پر اپنا شعر موزوں کرتے رہے لیکن آہستہ آہستہ غزل گو شاعروں سے متاثر ہونے کے بعد فارسی عروض کی ٹکنک پر غزل کہنے لگے۔ "دیوانِ سانگی" دو جلدوں میں شائع ہو کر زینتِ وطن بنا۔ سانگی کے آخری دور کا کلام شائع نہیں ہو سکا ہے۔ انہوں نے اپنے کلام میں کئی ایک اچھوتے اور دلپسند تجربے کئے ہیں جن سے سندھی غزل میں گرانقدر اضافے ہوئے ہیں۔ سانگی ایک بڑے صناع تھے۔ اپنے ماحول سے اتنے وابستہ رہے ہیں کہ ان کے کلام سے معاشی، معاشرتی حالات کا اچھی طرح سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ تمدنی اور تہذیبی اثرات سے اتنا متاثر ہوئے ہیں کہ اس ماحول کے اچھے ترجمان اور عکاس بن گئے ہیں۔ غزل کے بنیادی موضوع 'عشق' کو مدنظر رکھتے ہوئے مختلف عشقیہ کیفیات کو بڑی خوبی سے نبھایا ہے۔

سانگی کی شاعری میں وارداتِ قلبیہ کے گہرے اثرات ملتے ہیں۔ امیرانہ وضعداری کو قائم رکھنے کی کئی مثالیں مل سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ سانگی ایک بڑے فطرت نگار تھے۔ شہر سے باہر سیر و شکار کے سلسلے میں انہیں قدرت کے رنگارنگ مناظر سے لطف اندوز ہونے کا موقعہ ملا۔ وہ ان مناظر کا بغور غایت مطالعہ کرتے رہے۔ ایسی بیشتر مثالیں سانگی کے کلام سے ملتی ہیں۔ کلام میں انگریزی لفظوں کا استعمال کرنا اور انگریزی لفظوں کو سندھی صورت دینا سانگی کی افتادِ طبیعت کی دلیل ہے۔ اس لحاظ سے سانگی کا کلام منفرد حیثیت رکھتا ہے۔

زندگی کے مصائب و آلام کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ زندگی کے صحیح مقصد کو پالیتے ہیں۔ وہ فقط جذبات کے دھارے پر نہیں بہتے بلکہ ہوش و خرد سے بھی کام لیتے ہیں۔ وہ زندگی کی مسرتوں اور آرائشوں سے بھی خوب واقف ہیں اور غم و اندوہ کی کسک کو بھی دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتے ہیں ان کے ہاں غمِ جاناں اور غمِ دوراں کا ذکر ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ غمِ جاناں سے نجات ملی تو غمِ دوراں میں مبتلا ہو گئے۔ ان کے کلام میں وہ سب خوبیاں تھیں جو انیسویں صدی کے بلند پایہ اساتذہ کے ہاں پائی جاتی ہیں۔ سندھی غزل کو سانگی نے عروج پر پہنچایا اور صحیح معنوں میں سندھی غزل کا انہیں پیغامبر کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا۔ سندھی زبان کے علاوہ سانگی نے اردو اور فارسی میں بھی لکھا ہے۔

انگریزی سامراج کے تسلط کے بعد "وادیٔ مہران" کا سماجی اور معاشی شیرازہ بکھر گیا۔ اور حکومت کی تبدیلی سے سندھ تغیر کے ایک نئے موڑ سے روشناس ہوا۔ جس نے زندگی کے ہر شعبہ کو ایک نئے راستہ پر لا کر کھڑا کیا۔ سندھی نظامِ معاشرت کی جڑیں اکھڑ گئیں اور آئے دن نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ جس سے نئے خیالات اُبھرنے کے مواقع پیدا ہوئے۔ نئی نئی تحریکیں اُبھرنے لگیں اور نئے نئے نظریات کا پرچار ہونے لگا۔ فرنگیوں کی حکومت کے زیرِ اثر ایک نیا معاشی نظام پیدا ہوا۔ اپنی

پرانی روایات اور اپنے خاندان کی حکومت کی شان وشوکت کو کیسے بھلایا جاسکتا تھا۔ حاکم کو محکوم بن کر رہنا تھا۔ انگریزوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا بھی ضروری امر تھا، ورنہ معاشی واقتصادی بدحالی کی وجہ سے عرصۂ حیات تنگ ہوجاتا۔ سانگی کی ایک سندھی غزل کا ترجمہ پیش کر رہا ہوں۔

نکلے ہم گئے گھر سے، کہ جب اہلِ وطن بگڑے
نہ تھی جن سے توقع ایسے یارانِ کہن بگڑے (وغیرہ)

سانگی کے سندھی کلام کے چند اقتباسات پر اکتفا کروں گا۔ اپنے معاشرے پر چوٹ کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

قدر شرفا جو زماني ۾ ذرو ڪو نه رهيو
نقد جنهن وٽ آهي تنهنجي آهي خاني

(زمانہ میں شرفا کی قدر قطعاً نہ رہی اے محبوب! جس کے پاس زر موجود ہے اس کا اقتدار ہے)

ایک جگہ کہتے ہیں:۔

ڪانه ڪا جاءِ مليمان کي بجز قيد فرنگ
تني زماني ۾ اسان جي جي سڪندر پيدا

(اسے سوائے قیدِ فرنگ کے اور کوئی جگہ نہیں ملی اگر ہمارے زمانہ میں کوئی سکندر پیدا ہو)

زمانہ کی بدلتی ہوئی رفتار کو دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں۔

هن گلشنِ هستي ۾ گردش گردون
بلبل جي عوض زاغ جي لات آهي ته ڇا ٿيو

(اس گلشن ہستی میں گردوں کی گردش کی وجہ سے اگر بلبل کی بجائے کوّے کی لات سننے میں آئی تو کیا ہوا)

مندرجہ بالا اشعار سے شاعر کی ذہنی عظمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ بدلتے ہوئے ماحول کا بغور

نظر مطالعہ کرنا اور اسے سادگی سے پیش کرنا سانگی کا عظیم کارنامہ تھا۔

حسن و عشق کی شاعری میں ترنم پیدا کرنے کے لئے سانگی نے مخصوص بحور اور مخصوص لب و لہجہ کا استعمال کیا ہے۔ وہ مظاہرِ حسن سے اتنے متاثر ہوتے ہیں کہ ان کے تاثرات کی جھلکیاں ان کی شاعری میں رواں دواں ہیں۔ ان کی عشقیہ شاعری وجدان کی تسکین کا باعث بنتی ہے۔ کچھ اقتباسات پر اکتفا کرتے ہوئے مقالہ کو ختم کرتا ہوں۔

رقص حوروں نے کیا وجد میں غلماں آئے
مست تیرے جو قیامت میں غزلخواں آئے

زمرۂ رنداں میں تھا میں سرفراز
نام میرا بھی کبھی مے نوش تھا (اردو)

یاروں میں جب نہ رشتۂ الفت رہا تو میں
ہاں تنگ ہو کے وادیٔ مجنوں کو چل دیا (اردو)

چند اور اشعار ملاحظہ ہوں۔

ازل کان محو هیس عشق بتان ۾
تنهن پيدا ٿيس هندستان ۾
(ازل سے عشقِ بتاں میں محو رہا۔ اس لئے تو ہندوستان میں پیدا ہوا)

هر هر ڏنو ٿي حال دل بيقرار شمع
هئي شام کان به تا به سحر اشڪبار شمع

(شمع بار بار دلِ بیقرار کی حالت کو دیکھ رہی تھی اور شام سے صبح تک اشکبار رہی تھی)

دل ڏيڻ جاءِ دلستاني جا
ڪهڙا ڪهڙا نه مون ڏٺا اسرار
(دل دینے اور دلستانی کے کیسے کیسے میں نے اسرار دیکھے)

برهه جا نه بيمار آهيون اسين
اسان جو ڪندو ڪير احمق علاج
(عشق کے ہم بیمار ہیں۔ ہمارا کون احمق علاج کرے گا)

ڪين حاصل ٿيو هوشياري مان
مون کي ساقي ڀري ڏي جام شراب
(ہوشیاری سے کچھ بھی حاصل نہ ہوا اے ساقی! مجھے جامِ شراب پُر کر کے دے)

بلبلين کي وسري ويندو نغمو
باغ ۾ تيان جي غزل خوان آءٌ
(بلبلیں نغمہ بھول جائیں اگر میں باغ میں غزل خواں ہو جاؤں)

پنڌ پنهنجو اجان پري آهي
لامڪان ۾ مڪان ڪريان نه ڪريان
(فاصلہ اپنا دور ہے۔ لامکاں میں مکاں کروں یا نہ کروں)

میر عبدالحسین سانگی

ترجمہ - مہاراز

○

رقص حوروں نے کیا وجد میں غلماں آئے
مست تیرے جو قیامت میں غزلخواں آئے

کیوں نہ ہو وحشتِ دل صبر و سکوں سے بیزار
یاد تیری جو کبھی زلفِ پریشاں آئے

دل میں اک درد لئے پہنچا جو در پر تیرے
دھمکیاں دینے مجھے کتنے ہی درباں آئے

دیکھ کر میری پریشانیٔ فرقت اے دوست
مدتوں شام و سحر چاکِ گریباں آئے

کیا کہوں اس رخِ پرنور کا عالم سانگی
ماہ و انجم بھی مرے سامنے حیراں آئے

سانگی

ترجمہ:- راز

ہوئے ہم خانماں برباد جب اہلِ وطن بگڑے
بنایا تھا جنہیں اپنا وہ یارانِ کہن بگڑے
مسلمان و کرستان و یہود و برہمن بگڑے
نجانے رفتہ رفتہ کیوں زمانے کے چلن بگڑے
ہوا ایسی چلی بیگانگی کی صحنِ گلشن میں
چمن کی سیر کو آئے تو مرغانِ چمن بگڑے
مقدر میں خزاں کی یورشِ پیہم ہے اور ہم ہیں
بہاریں لیکے جو آئے تھے وہ گل پیرہن بگڑے
عجب یہ انقلابِ زندگی ہے وائے محکومی
رسوماتِ کہن سے یک بیک سب مرد و زن بگڑے
اثر صحبت کا ہوتا ہے مجھے اس پر یقیں آیا
زمانے کے بگڑ جانے سے جب اہلِ سخن بگڑے

میلہ

پچھلے سال یہی دن تھے، وہ پیر کے مزار کے پاس بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ ایک سال گزر چکا تھا پچھلے تمام واقعات اس کے دماغ میں چکر لگا رہے تھے اور وہ مجاور کے سوا روپیہ والے وظیفے کا ورد کر رہی تھی۔ مقبرے کے باہر بڑا ہنگامہ تھا۔ صحن زائرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ شہر کی مشہور رقاصہ سردار اختر گا رہی تھی "جب پیار کیا تو ڈرنا کیا" مرد عورت، بچے، بوڑھے سب لطف اندوز ہو رہے تھے۔ قریب ہی ایک سندھی فنکار اکتارہ پر شاہ لطیف کی کافی گا رہا تھا۔ کچھ سنجیدہ اور نیم سنجیدہ قسم کے لوگ اس کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے اور کلام سے لطف اٹھا رہے تھے۔

پیر کا موٹا مجاور تین عورتوں کی قسمت کا فیصلہ کر رہا تھا۔ فرش پر کچھ ریزگاری بکھری پڑی تھی اور نوٹوں کی ایک گڈی اس کی ران کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ لالٹین جل رہی تھی۔ ایک بوسیدہ سی کتاب اُسکے سامنے کھلی ہوئی تھی۔ چشمہ ناک پر اور آنکھیں ایک نوجوان برقعہ پوش دوشیزہ کے ہاتھ پر تھیں۔ مجاور کے ہونٹ ہل رہے تھے جیسے چپکے چپکے کوئی راز کی بات کہہ رہا ہو کہتے ہیں کہ ہاتھ پر تو انسان کی قسمت لکھی ہوتی ہے۔ مجاور کا گنجا سر مدھم روشنی میں چمک رہا تھا۔ مونچھوں کے بال کھڑے ہو گئے تھے اور گرمی کی وجہ سے نتھنے پھول رہے تھے۔ ململ کے کرتے میں اس کی پھولی ہوئی توند جھلک رہی تھی۔ کالی دستار بتاشوں اور مٹھائی کے تھال کے ساتھ رکھی ہوئی تھی۔ مجاور کا سوا روپیہ والا وظیفہ دور دور تک مشہور تھا۔

وظیفہ کا ورد کرتے کرتے اسے سوا سال پہلے کا زمانہ یاد آ گیا جب وہ نوزل سے پہلی بار مقبرے کے باہر پن پیاؤ کے پاس ملی تھی۔ نوزل کی بدتمیزی اسے ایک آنکھ نہ بھائی تھی وہ پیر کی زیارت کرنے گئی تھی محبت کرنے نہیں۔ ادب کی جگہ تھی لیکن بے شرم نوزل کو خانقاہ کا خوف بھی نہ تھا۔

تمام رات وہ ایک عجیب قسم کی ذہنی الجھن میں کروٹیں بدلتی رہی۔ اسکا بوڑھا شوہر خرّاٹے بھر رہا تھا۔ نئی شادی کئے ہوئے اسے صرف چھ مہینے گزرے تھے۔ سترہ سال کی ایک حسینہ کو ساٹھ سالہ بوڑھے کے ساتھ نتھی کر دیا گیا تھا۔ بوڑھے کو اولاد کا بڑا شوق تھا۔ دولتمند کو ہمیشہ وارث کی فکر ہوتی ہے آخر اتنی بڑی دولت کا کوئی وارث تو ہونا ہی تھا۔ لیکن بوڑھا افیون کی گولی کھا کر رات ہونے سے پہلے ہی اونگھنے لگتا اور دن کو حکیموں کے مشورے سے مختلف کشتے بنانے کی مشق کیا کرتا۔ شادی کے بعد اس کا یہ معمول بن چکا تھا۔ نہ جانے کیا سوچتے سوچتے وہ سنجیدگی سے نورل کے بارے میں کچھ سوچنے لگی تھی۔ اچانک اسکے ذہن میں خوبصورت اور تنومند نورل کی صورت پھرنے لگی۔ بڑی بے چینی اور حقارت سے اُس نے ایک نگاہ اپنے بوڑھے شوہر کے چہرے پر ڈالی۔ بے دانت کا کھلا ہوا منہ، نسوار سے بھری ہوئی ناک، چیکری داڑھی، منڈی ہوئی مونچھیں۔ دفعتاً اسے کراچی کے چڑیا گھر کا بوڑھا بندر یاد آگیا۔

دوسرے دن شام کو وہ حسب معمول پیر کی زیارت کے لئے نکلی تھی۔ چوک میں نورل کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اسکے پاؤں ڈگمگانے لگے۔ وہ پیر کے مقبرے میں داخل ہوگئی اور نورل بھی فاتحہ پڑھنے کے لئے قبر کے سرہانے کھڑا ہوگیا۔ نورل کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ دونوں ہاتھ اُٹھے ہوئے تھے لیکن آنکھیں قبر کی بجائے کسی کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ بھی کبھی کبھی کنکھیوں سے نورل کو دیکھ لیتی۔ اسے آج نورل کا چہرہ پیر کی قبر سے بھی زیادہ جاذب نظر معلوم ہو رہا تھا۔

پیر کا میلہ سال میں ایک ہی مرتبہ ہوتا ہے۔ لوگ بڑی تمنائیں اور مرادیں لیکر آتے ہیں۔ سال بھر میں یہی تو ایک دن تو درحقیقت مجاور کے فصل کاٹنے کا دن ہوتا ہے۔ خانقاہ کے اندر اور باہر زائرین کا ہجوم بے پناہ۔ نقابوں میں بے نقابی کا عالم، خوانچے والوں اور فقیروں کی ملی جلی صدائیں۔ رقص و نغمہ کی بزم آرائیاں، اکتارے، پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے غریب موسیقار، شاہ لطیف سچل سرمست

اور بیدل وغیرہ کی کافیاں۔ ایک احاطے میں کچھ موالی بھنگ گھوٹ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک چلا کر کہتا ہے "جو پئیں وہ جئیں" کچھ موالی چرس کی سلفیوں سے دھواں نکال رہے ہیں "لگے دم مٹے غم" ایک موالی چیخ کر کہہ رہا ہے "مر گئے مردود جن کی فاتحہ نہ درود"۔

پچھلے سال آج ہی کی رات تھی جب وہ نورل کے قریب آگئی تھی۔ خانقاہ کے ایک حجرے میں ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ محبت کے عہد و پیمان ہوئے تھے اور پوری کائنات سمٹ کر اس حجرے میں آگئی تھی۔ میلے میں ہر ایک اپنی اپنی دھن میں مگن تھا۔ کسی کو کیا پڑی تھی کہ انکی ملاقات میں مخل ہوتا۔

نورل سے اس کی ملاقات اکثر ہوتی رہی۔ پھر ایک دن نورل نے اپنے تبادلہ کا ذکر کیا۔ اسکے سر پر جیسے رنج و غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہ زبان سے کچھ نہ کہہ سکی۔ لیکن اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ نورل نے بہت جلد لوٹنے کا وعدہ کیا لیکن اُسے تسلی نہ ہوئی۔

پردیسی چلا گیا۔ وہ انتظار کی گھڑیاں گنتی رہی۔ اب وہ تیسری بار سوا روپئے والا وظیفہ مقبرے کے ایک گوشے میں بیٹھی پھر آزما رہی تھی۔ اور خدا جانے کن خیالات میں گم تھی۔ مقبرے میں کسی نے باآوازِ بلند مولود پڑھنا شروع کیا، اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اُس نے اپنا برقعہ سنبھالا اور آہستہ سے باہر نکل گئی۔

صمد رضوی ساز

نام :- سید عبدالصمد رضوی   تخلص :- ساز

پیدائش :- ۱۹۱۲ء   وطن :- حیدرآباد - دکن

تعلیم :- بی - اے - ایل - ایل - بی (عثمانیہ)   ہجرت :- ۱۹۴۷ء

موجودہ پتہ :- سیو بازار - لاڑکانہ

مشاغل

وکیل سرکار (۱۹۵۰ء تا) صدر بزم ادب لاڑکانہ (۱۹۴۸ء تا حال)

رکن ادارۂ مصنفین پاکستان

تصانیف

۱۔ منتخب نظمیں اور غزلیں جو ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کی طرف سے "شعرائے عثمانیہ" میں شائع ہوئیں (۱۹۳۹ء)

۲۔ منتخب کلام جو مع سوانح حیات کے ساہتیہ اکیڈمی - آندھرا پردیش کی طرف سے "حیدرآباد کے شاعر" میں شائع ہوا۔ (۱۹۵۸ء)

۳۔ اردو ڈرامے "شکست" اور "کشمکش"

(یہ دونوں ڈرامے بزم ادب کی طرف سے اسٹیج پر بھی پیش کئے گئے)

ایک ہم قلم سے

ہم قلم!! عزتِ قلم رکھ لے
عمرِ دورِ ستم دراز نہ کر
انتظارِ سحر میں جاں دیدے
ظلمتِ شب سے ساز باز نہ کر

نوکِ شمشیر کیا، ضمیر سے ڈر
جس سے زندہ ہے سوز و سازِ حیات
کس کے آگے جھکا رہا ہے سر
تجھ پہ ہنستی ہے رفعتِ لات و منات

چند پھولوں کے نام پر ناداں
خونِ گلشن کیا نہیں کرتے
بیچ کر ذہن و دل سی جنسِ گراں
ہوش والے جیا نہیں کرتے

اپنا مسلک نہ مصلحت نہ گریز
ہم تہِ تیغ مسکراتے ہیں،
وقت ہوتا ہے جب بھی نفرت خیز
ہم محبت کے گیت گاتے ہیں

ایک ہم وطن سے

مجھ کو تسلیم کہ مدت سے ہوں میں مہر بلب
نہ کوئی گیت ہے ہونٹوں پہ نہ کوئی فریاد
پھول ہنستے ہیں نہ تاروں سے پیام آتے ہیں

چھیڑتا ہی نہیں اب بربطِ دل کے نغمے
چاندنی رات میں نظارۂ سرو و شمشاد
اب نہ تقدیر کا شاکی نہ زمانے کا حریف
زعمِ باطل ہے مجھے اور نہ خوفِ صیاد
بے حسی کا مجھے الزام نہ دے اے ہمدم

مجھ سے ممکن ہی نہ تھی دورِ خزاں سے سازش
ہاں یہ ممکن تھا چمن ہی کو میں کر دوں برباد
زندگی جبرِ مشیت تو نہیں ہے اے دوست
کاٹنی پڑتی ہے پھر بھی ہیں شاد و ناشاد
وقت و ماحول نے لوٹے ہیں بصد جبر و فریب
میری رنگینیٔ و سرمایۂ فکرِ آزاد

کتنے بے نام غم اپنائے ہیں تو کیا جانے
کتنے رنگین محل ڈھائے ہیں تو کیا جانے

جواب

الم نصیب کو مدت کے بعد یاد کیا

غلط غلط کہ تجھے تیرا ساز بھول گیا
ترے تڑپتے ہوئے دل کا راز بھول گیا

بجا بجا کہ نہیں اب تو کائنات کا راز
کہ سن رہا ہوں میں دکھ درد کی ہر اک آواز

مری نگاہ کی زد میں ہے وہ مقامِ حیات
جہاں نہ صبحِ درخشاں ہے، اور نہ چاندنی رات

جہاں ہلاکت و افلاس و موت طاری ہے
جہاں سیاستِ مکر و فریب جاری ہے

میں اس مقام کی تاریکیاں مٹا دوں گا
جہنموں کو بہشتِ بریں بنا دوں گا

مرے حبیب میں سمجھاؤں کس طرح تم کو
جگر کے داغ دکھاؤں نہ ماہ و انجم کو

یہ بے شعور، یہ بے عقل مادّی جلوے
پسیج جائیں گے کیا صرف گرم آہوں سے

یہ زرد زرد ستارے بجھے بجھے سے چراغ
کہ جیسے فکر سے محروم آدمی کا دماغ

یہ ایک بے حس و بے دل نظامِ شمس و قمر
نہیں ہے اس میں ہمارے غم و خوشی کا گذر

تصورات کی دنیا محض فریبِ خیال
جھلس دے جسکی نزاکت حقیقتوں کا جلال

ہے ایک جہدِ مسلسل میں زندگی کا نظام
کہاں ہے، اس میں کسی کی شکستِ دل کا مقام

فغانِ وآہِ سحر، نالہائے نیم شبی
بدل سکیں گے نہ تقدیرِ کائنات کبھی

شفق، ستاروں بھری رات، چاندنی کا فسوں
تجھے خبر ہے کہ برسوں میں ان سے کھیلا ہوں
جمالِ موسمِ گُل میں نے بارہا لوٹا
جوان چاندنی راتوں کو برملا لوٹا
رہا ہیں ہم سفرِ ابرِ کوہسار کبھی
دکھائے تاروں کو سینے کے لالہ زار کبھی
مگر سکون مجھے کائنات دے نہ سکی
تمام شورشِ بزمِ حیات دے نہ سکی

ترے سماج سے اب انتقام لیتا ہوں
تجھے بشارتِ فصلِ بہار دیتا ہوں

ٹیگور

جہانِ شعر کے اے تاجدارِ غیر فانی آ
مغنیِ جمال و نغمہ سنجِ زندگانی آ

فدائے حسنِ فطرت، ماہرِ جادو بیانی آ
جلال و عظمتِ قدرت کی پائندہ نشانی آ

اِدھر آ واقفِ ہر وارداتِ قلبِ انسانی
اِدھر آ کاشفِ اسرار و کیفیاتِ روحانی

صبا کی چھیڑ پر غنچوں کی تو نے پاسداری کی
گل و بلبل کی رنگین داستاں کی رازداری کی

فضا کی ظلمتوں کو خلعتِ حسنِ جواں بخشا
مناظر کی لطافت کو دلِ شاعر زباں بخشا

جہانِ سیم و زر کو دولتِ شمس و قمر دیدی
حیاتِ قلب کو رنگینیِ ذوقِ نظر دیدی

شباب و حسن و الفت سے فضا کو بھر دیا تو نے
بہت ہی خوبصورت زندگی کو کر دیا تو نے

گھنے جنگل کی ٹھنڈی چھاؤں میں اب کون آئیگا؟
تھپک کر لوریاں دیدے کے دریا کو سلائیگا؟

طلوعِ صبح کی گلپاشیوں میں مسکرائے گا؟
لبِ دریا سکوتِ شام میں آنسو بہائیگا؟

جبینِ چرخ پر افشاں ستاروں کی جمائیگا؟
رخِ مہتاب کو بادل کی زلفوں سے سجائیگا؟

کریگا کون اب روتی ہوئی راتوں کی غمخواری؟
سحر پر کون برسائے گا اب انوارِ بیداری؟

گلوں کی چاک دامانی پہ اب شبنم نہ روئے گی
نہ منھ نورِ سحر میں نیم وا غنچوں کا دھوئے گی

گھٹائیں ٹھوکریں کھائیں گی کہسار و بیاباں میں — بہاریں روئیں گی سر پیٹ کر صحنِ گلستاں میں
روپہلی چاندنی کو کون اب لوٹے گا صحرا میں — مہ و انجم کو نہلائیں گے کس کے ہاتھ دریا میں
ستارے روئیں گے ویران خاموشی میں راتوں کی
پکاریں گے تجھے سنسان تاریکی میں راتوں کی
محبت، داستانِ سوز کس دل کو سنائے گی — شباب و حسن کی دیوی کو کیسے نیند آئے گی
اب اس کو کون قلب و روح کے نغمے سنائے گا
دلِ دوشیزۂ فطرت کو کیسے چین آئے گا
تری آواز اب بھی گونجتی ہے سبزہ زاروں میں — ستاروں، کوہساروں، جوئباروں، آبشاروں میں
وہ بارش لانیوالی سرد اور بوجھل ہواؤں میں — برس کر جنگلوں پر دوڑنے والی گھٹاؤں میں
دلِ انسانیت پر سحرِ نغمہ چھا گیا تیرا
فضا کے ذرہ ذرہ کو تڑپنا آ گیا تیرا

اِن دِنوں کچھ یہی عالم ہے مرے دل کا ندیم

(اپنی آخری نظم جس میں، میں نے اپنی موجودہ ذہنی حالت کی صحیح ترجمانی کی ہے۔ ساز)

پھول کو تپتی ہوئی ریت جلا دے جیسے
اپنی تخلیق کو فن کار بھلا دے جیسے
یک بیک جیسے اُجالوں کو اندھیرا ڈس لے
چاند اور تاروں کی جیسے کوئی مشکیں کس لے
جیسے کوہِ کہر آلود کے دھندلے پتھر
اپنے سینے میں چھپائے ہوئے طوفانِ شرر
اجنبی شہر میں جیسے کوئی گم کردہ سفر
جیسے بجھتے ہوئے تاروں کے دیئے وقتِ سحر
وسعتِ دشت میں جیسے کوئی نغمہ کھو جائے
جیسے پتوار لئے ہاتھ میں مانجھی سو جائے

اِن دِنوں کچھ یہی عالم ہے مرے دل کا ندیم

زندگی نغمۂ خیام نہیں ہے اے دوست!

کتنے فرعون خدا دوست نظر آتے ہیں
کتنے شدّاد غریبوں پہ ترس کھاتے ہیں
کتنے ابلیس فرشتوں کی جگہ پاتے ہیں
کتنے کافر ہیں جو ایمان کے گُن گاتے ہیں

یہ جہاں شاہدِ گلفام نہیں ہے اے دوست
زندگی نغمۂ خیام نہیں ہے اے دوست

(۲)

کتنے مہتاب اندھیروں نے چھپا رکھے ہیں
کتنے طوفان، غریبوں نے دبا رکھے ہیں
کتنے جادو ہیں جو عشرت نے جگا رکھے ہیں
کتنے فتنے ہیں جو دولت نے اٹھا رکھے ہیں

یہ جہاں شاہدِ گلفام نہیں ہے اے دوست
زندگی نغمۂ خیام نہیں ہے اے دوست

ایشیا

(یہ نظم اُس زمانہ میں لکھی گئی جب انڈونیشیا کی جنگِ آزادی اپنے شباب پر تھی)

شکرِ صد شکر کہ مشرق کی زمیں جاگ اُٹھی
حکمتِ مغربِ چالاک نے دم توڑ دیا
جس کی دانستہ شب و روز پرستش کی تھی
ہم نے خود اپنے ہی ہاتھوں وہ صنم توڑ دیا

اک درخشندہ ستارہ بہ جلالِ خورشید
اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں نظر آتا ہے
ظلمتیں لرزہ بر اندام ہوئی جاتی ہیں
اور تارہ ہے کہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے

سر بکف آ گیا میدان میں شرق الہندی
وہ مجاہد، وہ سپاہی، وہ شہیدوں کا سفیر
اُس کی رگ رگ میں بھڑکتے ہیں بغاوت کے شرر
اُس کے سینے میں دھڑکتا ہے صداقت کا ضمیر

گھن گرج شور سے تھرّا گئے دشت و کہسار
ندیاں خون کی بہنے لگیں میدانوں میں
اے خوشا روز کہ بیدار ہوا عزمِ حیات
ظلم کی آگ سے جھلسے ہوئے انسانوں میں

اے ولندیزو! یہ شمشیر کی نوکوں سے کہیں
روحِ آزادیٔ جمہور بھی ہوتی ہے غلام
روک سکتا ہے بھلا کیا خس و خاشاک کا بند
ایک بپھرے ہوئے چڑھتے ہوئے دریا کا خرام

خون میں ڈوب گئی چین کی دیوارِ عظیم — ویٹ نام اور ملایا کے جواں چونک اٹھے
وقت خود جس کے تھپیڑوں میں بہا جاتا ہو — کس کی طاقت ہے جو اس سیلِ رواں کو روکے

ایشیا!!! اب وہ ترا دوست وہ پیارا مغرب
خامِ اشیاء کا خریدار نہیں آئے گا
ایک معصوم تمدن کا پیامی بن کر
تیری عظمت کا پرستار نہیں آئے گا

---

۲۳ مارچ سنہ ۱۹۵۶ء

سادہ دل کاش تو اس راز سے واقف ہوتا — تو نے اک سوئے ہوئے شیر کو للکارا ہے
ایک ٹھہرے ہوئے طوفان کو دعوت دی ہے — تو نے تہذیب کے سینے میں چھرا مارا ہے

تو ہے آسائشِ منزل کے تخیل میں مگن — اور میں پیچ و خمِ راہ سے گھبراتا ہوں
تو سوئے عرش ہے آمادۂ پرواز ابھی — مجھ پہ وہ بوجھ پڑا ہے کہ دبا جاتا ہوں

ہے فضاؤں میں اندھیرا ہی اندھیرا ہر سو — چند تارے مہِ کامل کی جگہ کیا لیں گے
ٹمٹماتے ہوئے، روتے ہوئے مرقد کے دیئے — تیرگی دامنِ ماحول کی کیا دھو دیں گے

ماتمِ منزلِ گم گشتہ سے آخر حاصل
دفن ہیں سینۂ فطرت میں ابھی راز کئی
چھیڑنے والے پہ ہے بارشِ نغمہ کا مدار
منتظر ہیں ابھی بجنے کے لیے ساز کئی

(پاکستانی عوام کے احساسات)

میری ایک رات

رات کا پچھلا پہر ہے سو گئی ہے کائنات
بے خبر ہر کشمکش سے ہو گئی ہے کائنات

ایک سنجیدہ خموشی ہے زمیں پر حکمراں
ایک گہری نیند میں سویا ہوا ہے آسماں

چاندِ شب کی آخری منزل کی جانب ہے رواں
اور ساکن دودیائی بادلوں کے بادباں

ہے اُفق کے سبز کہساروں پہ ماہِ زرد رو
پھیکی پھیکی مضمحل سی چاندنی ہے چار سو

جیسے دہقاں کی شکستہ حالیوں کا انتشار
یا کسی بیوہ کا ہو جیسے شبابِ سوگوار

پھول یوں مرجھا رہے ہیں گلشنِ افلاک کے
مندمل ناسور ہوں جیسے دلِ صد چاک کے

یہ اُداسی، یہ خموشی یہ جمودِ بے حسی!
موت کی آغوش میں سوتی ہے گویا زندگی

ایک سناٹا ہے ہر چیز پر چھایا ہوا
اے خدا سوتے ہیں کیا اس وقت سب میرے سوا

ایک دنیا تو خمارِ خواب میں مخمور ہے
ایک میں بھی ہوں کہ مجھ سے نیند کوسوں دور ہے

چٹکیاں لیتی ہے دل میں یاد اُن ایام کی ـــ!
دفن ہے اک داستاں جن میں دلِ ناکام کی

دل میں ہے موہوم اور مبہم خیالوں کا ہجوم
اور تڑپاتے ہیں اس کو ڈوبنے والے نجوم

دور نامعلوم دھندلی سی فضاؤں میں کہیں
تھی مری تخیل کی رنگین و روشن سرزمیں

اس جہانِ رنگ و بو سے اس فضائے نور سے
شعر و موسیقی کی رنگیں جلوہ گاہِ طور سے

وہ کہ جو ہے مطربِ مضرابِ سازِ زندگی
وہ کہ جو ہے بانیٔ سوز و گدازِ زندگی

وہ کہ نہلایا ہے میں نے اپنے اشکوں سے جسے
وہ کہ برمایا ہے میں نے اپنے نغموں سے جسے

اک سیہ چادر میں سارا جسم لپٹائے ہوئے
حسن کی رقصیدہ موجیں اس میں سمٹائے ہوئے

ریشمی زلفیں کمر تک اپنی لٹکائے ہوئے
پشت پر کچھ اور کچھ سینہ پہ بکھرائے ہوئے

مست آنکھوں سے مئے گلفام چھلکاتا ہوا
جنبشِ لب سے حسیں نغمات برساتا ہوا

ہر قدم پر سحرِ موسیقی کو ٹھکراتا ہوا
ذرہ ذرہ میں فضا کے روح دوڑاتا ہوا

آپ ہی اپنی اداؤں میں وہ بل کھانے لگا
مسکراتا جھومتا میری طرف آنے لگا

چپکے چپکے قلب کی گہرائیوں میں آگیا
رفتہ رفتہ رُوح کی بیتابیوں پر چھا گیا

نیند بن کر چھا گیا وہ میری چشمِ زار پر
اور ڈھلک کر گرم آنسو آگئے رخسار پر

بند آنکھیں ہو رہی ہیں نیند اب آنے لگی
صبح کا تارا وہ ڈوبا اور سحر گانے لگی

تلاشِ سکوں

مرا سکون یہ دنیائے ہائے و ہو میں نہیں — جہانِ حسن کی امواجِ رنگ و بو میں نہیں
نہ جلوۂ سحری میں نہ آفتاب میں ہے — نہ شام میں نہ شفق میں نہ ماہتاب میں ہے
نہ سوز و ساز میں نے بربط و رباب میں ہے — جہانِ شعر میں نے کرب و اضطراب میں ہے

نہیں مناظرِ فطرت کی دل نوازی میں
نہیں جہانِ حوادث کی کارسازی میں

ہزار بار لبِ جو کی سیر کی میں نے — بہارِ سبزہ و گل میں شراب پی میں نے
طلب کیا کبھی کہسار کی گھٹاؤں سے — کیا سوال کبھی صبح کی ہواؤں سے
عزیز دوست، خودی میں بھی آ کے دیکھ لیا — کبھی تجھے کبھی خود کو بلا کے دیکھ لیا
چمن چمن میں بہار و خزاں سے پوچھ لیا — کلی کلی سے، گل و گلستاں سے پوچھ لیا
زمیں سے مانگ لیا، آسماں سے پوچھ لیا — غرض کہ ساز نے دونوں جہاں سے پوچھ لیا

مگر سکون اسے کائنات دے نہ سکی
تمام شورشِ بزمِ حیات دے نہ سکی

مری تلاش پہ اے دوست مسکرائے جا — مرے جنونِ محبت کو آزمائے جا
سمجھ گیا جو مری جستجو کا حاصل ہے — مری حیات تری آرزو کا حاصل ہے

تری خوشی میں نہاں ہیں مسرتیں میری
سمٹ گئیں تری ہستی میں اقتیں میری

آرزوئے رنگین

جب رات کی گہری تاریکی خاموش خلا پر چھا جائے   جب خاک کے ذرّے ذرّے پر اک کالا ناگ سا لہرائے
جب ننھے ننھے تاروں کی آنکھوں میں نیند سما جائے   اک ہوشِ طلب بیہوشی سی پتّے پتّے پر چھا جائے
جب گردشِ پیہم سے تھک کر جنگل کی ہوائیں سو جائیں   پھولوں کی پریشاں نکہت سے بدمست فضائیں سو جائیں
جب فکرِ حال و مستقبل ہٹ جائے دماغِ ہستی سے   صہبائے فراموشی چھلکے دنیا پہ ایاغِ ہستی سے
جب ہستی کی ہر موجِ نفس مخمورِ شرابِ راحت ہو   پابوسِ حسنِ محبت ہو اور حسن نثارِ الفت ہو
جب ٹوٹ کے سیارہ کوئی تاریکیوں میں گم ہو جائے   جب نبضِ حیاتِ خفتہ میں اک لرزش ہو کر کھو جائے

جب لیلائے شب کی زلفیں آ جائیں کمر تک بل کھا کر
کہسار کی چوٹی سے جھانکے وہ لالہ گوں بدمست قمر

یوں جیسے کوئی دوشیزہ مخمور نگاہوں سے تاکے   یا انگڑائی لیکر اٹھے رنگین گلوں کے بستر سے
جب بہکی بہکی کرنوں کا احساسِ خمارِ صہبائی   لے نیم شگفتہ کلیوں کی دوشیزہ فضا پر انگڑائی
جب چاند کے روشن چہرے پر بادل کی زلف پریشاں ہو   جب دریا کے آئینہ میں وہ پرتوِ انجم رقصاں ہو
فطرت کے حسیں نظاروں میں جب جلوے نظر کے ساماں ہوں   جب حسن کی رنگیں دنیا میں معصوم فرشتے خنداں ہوں
جب جگمگ جگمگ کرنے لگے پتّی پتّی، ڈالی ڈالی   وہ روشن خواب نئی دنیا جو دیکھے جوگن متوالی

جب چاروں طرف خاموشی ہو بیہوشی ہو بدمستی ہو
فطرت کی مکمل خاموشی پیغام سکوں کا دیتی ہو

تو ایسے زریں لمحوں میں آ میری خیالی دنیا میں
رنگیں تصور کی رنگیں پرکیف خماری دنیا میں

اک نغمۂ دلکش بنکر آ، اور دل کی گہرائی میں اتر
احساسِ مسرت بن کر آ اور چھا جا میری ہستی پر

پیکانِ لطافت بنکر آ، آئینۂ حیرت بن کر آ
تصویرِ شرارت بن کر آ، آ دردِ محبت بنکر آ

تسکین کی دنیا بن کر آ یا درد کا عالم بن کر آ
یا عیشِ مجسم بنکر آ یا پیکرِ صد غم بن کر آ

پیمانِ الستی بنکر آ، بھولی ہوئی ہستی بن کر آ
ادراک کی آنکھیں کھلجائیں، وہ عالمِ مستی بنکر آ

آ غمگیں زیست کا سرمایہ کردوں میں ترے قدموں پہ نثار
آنکھوں کے آنسو دل کی جلن ٹھنڈی آہیں صبر و قرار

مر جاؤں فرطِ مسرت سے دل میرا اتنا شاداں ہو
چہرہ سے عیاں ہو جوشِ طرب ہونٹوں پہ تبسم رقصاں ہو

پرنور ستاروں کے چہرے اس دم پژمردہ ہوتے ہوں
چاند اونگھ رہا ہو بادل میں اور دنیا والے سوتے ہوں

شامِ صحرا

جنگل کی سنسان فضا میں شام کی دیوی آتی ہے
دشت و جبل پر اک ناگن سی تاریکی بل کھاتی ہے
گہرے اُودے ابر کے سائے کھیل رہے ہیں کھیتوں میں
جیسے تخیل کی رنگینی ذہنوں میں لہراتی ہے
ایک طرب انگیز مسرت سرد ہوائیں آوارہ
پتی پتی، ڈالی ڈالی، کھوئی کھوئی جاتی ہے
ایک سیمیں پیکر ندی گل پاشِ شفق کی بارش میں
بنسی بجانے والے چرواہے کی دُھن میں گاتی ہے
ایک مکمل بے ہوشی سی قلبِ صحرا پر طاری
ایک الم انگیز سکوں میں دنیا ڈوبی جاتی ہے
بوڑھے املی بن میں مفلس دہقانوں کی اک وادی
یعنی تمدن کی لعنت، تہذیب کی خانہ بربادی
جھونپڑیاں خس پوش، دھوئیں میں لپٹی ہوئی دولت انکی
جن کے خون پسینے سے رنگیں شہروں کی آبادی

ذہن میں صدیوں کی تاریکی، خون میں پشتوں کی نکبت
اُن کے تصور میں بھی نہ آئی، موجِ احساسِ شادی
کچلے ہوئے جذبات ہیں مردہ روحیں، دل زندہ لاشیں
ان کا شعورِ زیست ہے، مسلسل محنت اور پھر بربادی
دنیا کے ٹھکرائے ہوئے ارمان و تمنا کیا جانیں
بھوکے ننگے جی لیتے ہیں، یہ ہے اُنکی آزادی
بھوک، جہالت، غربت، پستی کب تک اُن پر چھائے گی
شام و سحر کی رنگینی کب تک ان کو بہلائے گی
کب تک رکھے گی پوشیدہ فطرت کوہ و صحرا میں
وہ بجلی جو قصرِ امارت کی بنیادیں ڈھائے گی
سورج ڈوبا خونیں تارے کھیتوں پر تھراتے ہیں
طوفانوں کی آمد کے آثار سے پائے جاتے ہیں

بھول نہ جانا عہدِ وفا کو

سازکو "سازی" کہنے والے
غمِ الفت کا سہنے والے

پردۂ دل میں رہنے والے
بھول نہ جانا عہدِ وفا کو

ہو گیا اب جو کچھ ہونا تھا
کھو دیا ہم نے جو کھونا تھا

روئیں گے قسمت میں رونا تھا
بھول نہ جانا عہدِ وفا کو

میرا خزانہ میری دولت
تیری چاہت تیری چاہت

تیرا غم ہے میری امانت
بھول نہ جانا عہدِ وفا کو

دل میں ہر دم ہوک اٹھے گی
روتے روتے عمر کٹے گی

میری دنیا خوب لٹے گی
بھول نہ جانا عہدِ وفا کو

دل کو ترا احساس بہت ہے
چاہ کا تیری پاس بہت ہے

جینے کو یہ آس بہت ہے
بھول نہ جانا عہدِ وفا کو

غزل

یونہی یاد آتے ہیں گزرے زمانے
کبھی جیسے دیکھے ہوں سپنے سہانے

ہر اک لمحہ تازہ پیامِ محبّت
گزارے تھے ہم نے بھی ایسے زمانے

کہاں ہیں کہاں تہمتِ زندگانی
نہ مرنے دیا تیرے پاسِ وفا نے

ستائے تو شاہد ہیں پچھلے پہر کے
مرا حالِ دل کوئی جانے نہ جانے

بہت میں نے لوٹے بہت میں نے کھوئے
محبت کے خرمن وفا کے خزانے

نہ طوفاں نہ بادل، نہ موجوں میں ہلچل
کہاں لا کے چھوڑا مرے ناخدا نے

مبارک جنونِ بہاراں مبارک
قفس رہ گیا، جل گئے آشیانے

غزل

راہِ الفت میں ہو گئے بدنام　　کیا خرد کیا جنونِ پختہ کام
نغمہ و شعر و کیف و سرمستی　　میرے عہدِ شباب کے کچھ نام
اور کیا ہے فسانۂ ہستی　　خودنگر، خودپسند، خودانجام
مسجد و مندر و کلیسا کیا　　میری حدِ خودآگہی کے نام
آشیاں اور میں ارے توبہ　　مجھ پہ فکرِ چمن کا ہے الزام
اہتمامِ بہار اور ان سے　　عمر بھر جو رہے اسیرِ دام
وہ اٹھا وہ اٹھا سیہ بادل　　ساقیا ساقیا مئے گلفام
مدتوں کاروانِ رنگ و بو　　میرے پیچھے چلے ہیں صبح و شام

اللہ اللہ رے انقلابِ جہاں
ساز لینے لگے خدا کا نام

سراپا

چہرہ منوّر مہرِ درخشاں — عارض روشن ماہِ تاباں
برق نگاہیں تارے آنکھیں — کاکل پریشاں ابرِ بہاراں
گفتار دلکش گلریز و شیریں — رفتار فتنہ محشر بداماں
آواز لبریز موسیقیوں سے — رہزنِ دل مضرابِ رگِ جاں
ہر قہقہہ گویا قلقلِ مینا — ہر مسکراہٹ صبحِ خنداں
رنگین پیکر حسنِ شرابی — تخیّلِ فطرت تحصیلِ امکاں
جانِ ملاحت کانِ صباحت — از سر تا پا روحِ گلستاں
مستی سراپا شعرِ مجسّم — حسنِ مکمل شاعر کا ارماں

اے ساز وہ دشمنِ ہوش آیا
مستانہ لغزش رقصاں خنداں